نومبر ۱۹۸۷ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	ادارہ	۲
ہدایت القرآن (۱۹)	مولانا محمد تقی امینی	۵
منشورِ اسلام (۸)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۱۱
حضورؐ پر جادو کا واقعہ	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۲۱
غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ	قاضی اطہر مبارکپوری	۲۷
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے	حافظ محمد سلیمان	۴۰
حکمتِ اقبال (۸)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۴۷
نقطۂ نظر (اتحادِ امت کی حقیقی بنیادیں)	قاضی ظفر الحق	۵۶

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہہِ محرابِ مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

تہہ محراب مسجد سو جانے اور فرنگی بتکدے میں کھو جانے والوں کو بیک وقت جھنجھوڑنے اور صحافت میں ماضی قریب کی پُرعزیمت روایات کو زندہ کرنے کی ایک کوشش انشاءاللہ عنقریب.....

ہفت روزہ

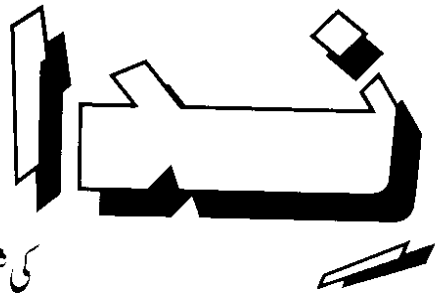

کی شکل میں منظرعام پر آئے گی۔

یکے از مطبوعات

محمد حمید احمد پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۴۱۔ اے شاہراہ پاکستان (لوئر مال) لاہور۔ ۱

فون ۸۔ ۳۲۰۱۹۶

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر : اقتدار احمد

شمارہ : ۱۱ | نومبر ۱۹۸۷ء بمطابق ربیع الاول ۱۴۰۸ھ | جلد ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ ۔ فون : ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون : ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور

حرفِ اوّل

قرآن کالج میں تعلیم کا آغاز

الحمدللہ کہ ماہِ اکتوبر کی ۱۰ تاریخ سے، حسبِ پروگرام، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام ایک نئے تعلیمی منصوبے قرآن کالج میں سلسلۂ تعلیم کا آغاز ہوگیا ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن کالج میں داخلے کے لئے ہماری توقع سے بہت کم درخواستیں موصول ہوئیں۔ تاہم یہ تعداد اتنی کم نہ تھی کہ کلاس شروع نہ کی جاسکتی۔ قارئین کرام اور بالخصوص اراکینِ انجمن کی دلچسپی کے پیشِ نظر ہم داخلوں سے تعلق مختصر کوائف رقم کر رہے ہیں۔

قرآن کالج میں داخلہ کے لئے کُل ۴۳ درخواستیں موصول ہوئیں۔ تمام طلبہ کو ٹیسٹ اور انٹرویو کے لئے مدعو کیا گیا۔ لیکن ٹیسٹ میں صرف ۲۶ طلبہ نے شرکت کی۔ ان میں سے ۲۲ طلبہ کا داخلہ منظور کیا گیا۔ اور ۱۷ طلبہ نے داخلہ لیا۔ اس طرح اللہ کے فضل وکرم سے قرآن کالج میں بی اے سال اوّل کی کلاس کا آغاز ۱۷ طلبہ سے ہوا۔

مؤرخہ ۱۰ اکتوبر بروز ہفتہ تعلیم کے آغاز کے سلسلہ میں ایک پروقار تقریب دعا منعقد ہوئی جس میں انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی، جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب نے بھی طلبہ سے خطاب کیا اور دعاءِ خیر فرمائی۔ اس تقریب کی رپورٹ متعدد مقامی روزناموں میں شائع ہوئی تھی۔ روزنامہ 'مشرق' نے اس سلسلے میں جو خبر شائع کی وہ ہدیۂ قارئین ہے۔

اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب (قرآن حکیم)

مشرق

اتوار ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۷ء

جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی حاصل کئے جائیں

قرآن کالج کی افتتاحی تقریب سے ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا محمد کاندھلوی کا خطاب

لاہور ۱۰ر اکتوبر (پ ر) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نئے تعلیمی منصوبے قرآن کالج میں تعلیم کے آغاز کے موقع پر قرآن اکیڈمی میں انجمن کے زیر اہتمام آج ایک تقریب افتتاح منعقد کی گئی۔ جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی اس سادہ اور پروقار تقریب کے مہمان خصوصی تھے

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد نے فرمایا کہ قرآن کالج کے قیام کی صورت میں ان کے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر پوری ہونے کی صورت پیدا ہوئی ہے اور یہ کالج چونکہ خدمت دین کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لہٰذا آج کا دن ہمارے لئے یوم تشکر ہے انہوں نے کہا کہ علمی سطح پر خدمت دین کا کوئی موثر کام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی حاصل کئے جائیں اور اس خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی جائے جو مدارس دینی اور سکول و کالج کے درمیان حائل ہو چکی ہے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے شیخ الہند کو ہوا تھا علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج کو پر کرنے کے لئے جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا مولانا ابوالکلام آزاد کا قائم کردہ دار الارشاد اور علامہ اقبال کا تجویز کردہ دارالاسلام اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ بدقسمتی سے یہ ادارے کوئی موثر کام کرنے سے پہلے ہی بوجوہ منتشر ہو کر رہ گئے

قرآن کالج کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؛ انہ صاحب نے توجہ دلائی کہ کسی بھی بڑے کام کی ابتداء عموماً نہایت چھوٹے پیمانے پر ہوتی ہے علی گڑھ کا آغاز ایک چھوٹے سے کالج کی شکل میں ہوا تھا دارالعلوم دیوبند کی ابتداء بھی ایک طالب علم اور ایک استاد سے ہوئی تھی ہمیں اپنی امکانی کوشش کرتے ہوئے اللہ سے دعا کرنی ہے کہ اس چھوٹے سے کام سے کام کو کسی بڑی دینی خدمت کا پیش خیمہ بنا دے

مولانا مالک کاندھلوی نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر صاحب کے اخلاص اور ان کی دینی خدمات کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا جو شخص بھی اخلاص کے ساتھ دین کا کام کرتا ہے اس کا تعاون کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے مولانا نے کہا کہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں قرآنی علوم کے فقدان کی وجہ سے بہت بڑا خلا پیدا ہو چکا ہے جس کے منفی اثرات ہماری اجتماعی زندگی میں واضح طور پر محسوس کئے جا رہے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ خود بھی گذشتہ بیس برس سے نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے کوشاں ہیں مولانا نے قرآن کالج کے قیام کو نہایت خوش آئند قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ محض ایک کالج کا قیام نہیں ہے بلکہ یہ جدید علوم کے ساتھ قرآنی علوم کو ہم آہنگ کرنے کی ایک تحریک ہے اور یہ تحریک اگر چل نکلے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہو گا آخر میں مولانا نے کالج اور اس کے طلبہ کے لئے دعا فرمائی

قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ داخلہ کے لئے درخواست دینے والے ۴۳ طلبہ میں سے ۲۳ طلبہ نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ ان میں چھ طلبہ وہ ہیں جن کے میٹرک میں ۷۰ فی صد یا اس سے زیادہ نمبر تھے لیکن انٹر میں ان ۲۳ میں سے صرف ۴ طلبہ فرسٹ ڈویژن حاصل کر سکے۔

انٹرویو کے دوران طلبہ سے مذکورہ صورت حال سے متعلق سوالات کئے گئے۔ اکثریت

نے اعتراف کیا کہ کالج میں ہوم ورک کی جانچ پڑتال نہ ہونا، یونین یا دیگر طلبہ تنظیموں میں شمولیت اور کالج کینٹین کی وجہ سے کلاسوں سے غیر حاضری، وہ اہم وجوہات ہیں جنہوں نے اس صورت حال کو جنم دیا ہے۔ ڈراپ طلبہ کو گھریلو پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

مذکورہ تجزیہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کالج میں کلاسوں سے غیر حاضری پر جرمانہ کا نظام اور ہوم ورک کی تاکید کا اہتمام وقت کی کتنی اہم ضرورت ہے۔ الحمد للہ کہ ہم نے قرآن کالج میں ان امور کا خصوصیت سے اہتمام کیا ہے۔ ہم اللہ کی رحمت سے پُرامید ہیں کہ ہمارا یہ تعلیمی منصوبہ کامیابی سے رُوبہ عمل آئے گا۔ اس سلسلے میں ہم رفقاء و احباب کی دعاؤں کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

●●●

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

(۱۹)

هدایتُ القرآن

مولانا محمّد تقی امینی

قوموں کی ذلّت وپستی کا سبب

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ تا يَعْتَدُوْنَ

اور ان پر ذلّت وپستی جمادی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے[۱]۔ یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے یہ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے[۲]۔

○

[۱] بنی اسرائیل کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کرکے یہ درمیان میں ان کی حرکتوں اور کاموں کا خلاصہ اور نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ کسی دور وزمانہ کا ذکر نہیں ہے جو قوم بھی اس قسم کی حرکتوں کا ارتکاب کرے گی اور ایسے کام کرے گی اس کا اسی قسم کا انجام ہوگا۔

خاص کر وہ قوم جس کے سامنے بلند وبرتر مقصد ہو اور دنیا کی قیادت وسرداری کے لئے اس کو چنا گیا ہو وہ اگر آزمائش کی مصیبتوں پر صبر نہ کرے گی۔ اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کرے گی اور ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھائے گی جو اللہ نے اس کو دیئے ہیں تو اس کو بنی اسرائیل کی یہ تاریخ سامنے رکھنی چاہئے۔

[۲] بنی اسرائیل کی تاریخ میں بہت سی شرارتوں اور سرکشیوں کے ذکر کے ساتھ نبیوں کے قتل کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سیعیاہ نبیؑ یرمیاہ نبیؑ زکریا نبیؑ اور یحییٰ نبیؑ کا قتل۔ یہ سب ان کے آپے سے باہر ہوجانے اور ساری حدیں توڑ دینے کی وجہ سے ہوتا رہا۔ ناحق قتل کا مطلب یہ ہے کہ بے خطا وقصور جانتے ہوئے نبیوں کو قتل کرتے تھے۔ یہ حضرات نہ تو کبھی کسی کی جان لیتے اور نہ فتنہ وفساد اور شرانگیزی میں مبتلا ہوتے تھے۔ یہ سبھی کو معلوم تھا کہ ان کا کام خیرخواہی وہمدردی اور کلمۂ حق کہنے کے سوا کچھ نہیں ہے پھر کون سی وجہ تھی جو ان کے خون کو مباح کرتی اور ان کے قتل حق قرار دے سکتی تھی۔

قوموں کی ترقی و سربلندی کا قانون

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا ... تا ... وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی نصرانی اور صابی ہیں ان میں جو اللہ پر آخرت کے دن پر ایمان لائے اور عمل صالح کئے ان کے لئے ان کا بدلہ اللہ کے پاس موجود ہے نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے

○

اوپر اللہ کے اس قانون کا ذکر ہے جو شرارتوں اور سرکشیوں کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب اللہ کے اس قانون کا ذکر ہے جو ایمان و عمل صالح کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کو پہلے سرکشی و شرارت میں بطور مثال ذکر کر کے بتایا گیا تھا کہ ذلت و پستی میں اس وقت جو حشر اُن کا ہے وہی ہر اس قوم کا ہوگا جو ان جیسی شرارت و سرکشی کی مجرم ہوگی۔ اب ایمان و عمل صالح کے نتیجہ میں کسی خاص قوم کا ذکر نہیں ہے بلکہ ترقی و سربلندی ہر اس قوم کے لئے ہے جو ایمان و عمل صالح اپنے اندر پیدا کرے گی خواہ بگڑنے کے بعد ایمان و عمل صالح پیدا کرے یا ابتداء ہی سے اس پر عمل پیرا ہو۔

آیت میں ایک بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہ یہ کہ اگلی و پچھلی قوموں میں اللہ کا قانون یہی رہا ہے کہ دنیا و آخرت کی کامیابی ہمیشہ ایمان و عمل صالح کی بدولت حاصل ہوتی رہی ہے نسل، خاندان اور گروہ کی بدولت کبھی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل کی زندگی سامنے ہے کہ نسل خاندان اور گروہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا لیکن ایمان و عمل صالح میں فرق آجانے کی وجہ سے ترقی و سربلندی کے بجائے ذلت و پستی کے گڑھے میں گر گئے۔ اگر نسل خاندان اور گروہ ترقی و سربلندی میں اہم کردار ادا کرنے والے ہوتے تو بنی اسرائیل کا یہ حشر نہ ہوتا۔

آیت کے انداز بیان سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ذلت و پستی کسی قوم کے ساتھ اس طرح نہیں چپکا دی گئی کہ وہ کبھی اس سے جدا نہ ہو۔ ذلت و پستی کے کام چھوڑ کر ایمان و عمل صالح اختیار کرے گی تو ذلت ختم ہو جائے گی۔ پھر ترقی و سربلندی حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

آیت میں قانون بیان کرنا مقصود ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ قرآن میں جس قدر بھی اللہ کے قانون بیان ہوئے ہیں ان میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پھر خبر نہیں کہاں سے ایمان کی تفصیلات کی بحث مل پڑی۔ یہ بات آیت سے نکال لی گئی کہ نجات و کامیابی کے لئے اللہ کے رسولوں اور خاص کر آخری رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے جب کہ اس جگہ جتنی دینی قوموں کا ذکر ہے وہ رسولوں پر ایمان لانے والی تھیں اور مسلمان آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی ایمان لائے تھے۔ اس بنا پر رسولوں اور آخری رسول پر ایمان لانا خود بخود اس میں داخل ہے۔ علیحدہ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر اس جگہ تفصیل بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ اللہ کے بغیر نہ قرآنی ایمان کا وجود ہوتا ہے اور نہ قرآنی عمل صالح قرار پاتا ہے۔ اور آخرت کا ذکر اس بنا پر ہے کہ ایمان و عمل صالح کا یہ قانون دنیا و آخرت میں دونوں میں کامیابی کے لئے ہے کسی ایک کے لئے نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور عمل صالح کیا کیا ہیں؟ ان سب کی تفصیل وہاں دیکھنی چاہیئے جہاں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قرآنی حقیقت کو پانے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیت کس موقع پر ہے اور اس موقع پر آیت کا مقصود کیا بیان کرنا ہے؟ اگر قرآن کے مطالعہ میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تو ایسی ہی غلط فہمی پیدا ہوگی جیسا کہ اس آیت میں پیدا ہوئی۔

غلط فہمی اس وجہ سے بھی ہوئی کہ لوگوں نے اس قانون کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور آپ کے بعد کے لئے خاص سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ قانون شروع سے چلا آرہا ہے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کے لئے ہر مومن قوم کو ایمان و عمل صالح کی بنیاد ہی پر جانچا اور پرکھا گیا ہے اور سچے ایمان میں ہر نبی و رسول پر ایمان شامل رہا ہے۔ کسی پر ایمان اور کسی کے انکار کو کبھی بھی سچا ایمان نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔

آیت میں چار دینی قوموں کا ذکر ہے جو اس وقت نمایاں تھیں (۱) الذین آمنو (مسلمان) (۲) الذین ھادوا (یہودی نہ صرف بنی اسرائیل) (۳) النصاریٰ (نصرانی جو حضرت عیسیٰؑ کو نبی مانتے تھے)۔ (۴) الصابئین (جو توحید و رسالت پر عقیدہ رکھتے

تھے)۔ ان سب کو خبردار کیا گیا ہے کہ نجات و کامیابی کے لئے اصل ایمان و عمل صالح ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو قومی ترقی و سربلندی کے قانون میں اللہ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

بنی اسرائیل کی سرکشی و رُوگردانی

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ تا كُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا[1] اور تم پر کوہ طور بلند کیا[2] (اور کہا) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس کو مضبوط پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم (اللہ کی نافرمانی) سے بچو۔ پھر تم اس کے بعد پھر گئے اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم تباہ ہو جاتے۔

○

[1] بنی اسرائیل میں ذلت و پستی کی وجہ سے جو بُری خصلتیں ابھر آئی تھیں اور ان کی ترقی و سربلندی میں جو رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اب ان کا ذکر ہے۔ مثلاً عہد و معاہدہ اور قول و قرار کا لحاظ پاس بالکل نہیں رہ گیا تھا خواہ کتنے ہی مقدس جگہ میں اور کتنے ہی اہتمام سے لیا گیا ہو۔ یہ وہی عہد و معاہدہ اور قول و قرار معلوم ہوتا ہے جس کے لئے حضرت موسیٰؑ ستر مانے ہوئے لیڈروں کو طور پہاڑ پر لے گئے تھے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

[2] یہ پہاڑ کے دامن میں تھے اور اس کی بلندی میں چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور اس وقت پہاڑ میں زلزلہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس سے اس کے گرنے کا اندیشہ ہو رہا تھا۔ اس طرح نہایت مقدس جگہ میں اللہ کی عظمت و جلال تو دکھا کر اس کے احکام پر عمل درآمد و عہد و معاہدہ اور قول و قرار لیا گیا تھا۔ پھر بھی اپنی سرکشی سے باز نہ آئے اور اس کی خلاف ورزی کی۔ یہاں ان کی ذلت و پستی کی اسی ایک خصلت (بدعہدی) کا ذکر مقصود ہے۔

حیلہ سازی و اللہ کے ساتھ چالاکی

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا تا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔

اور بے شک تمہیں وہ لوگ معلوم ہیں جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی تو ہم نے ان سے کہا تم ذلیل بندر ہو جاؤ پھر ہم نے اس واقعہ کو اس زمانہ اور بعد کے لوگوں کے لئے عبرت کا تازیانہ بنایا اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنائی۔

لہ یہودیوں کی شریعت میں سنیچر کا دن نہایت مقدس اور عبادت کے لئے خاص تھا۔ اس دن کاروبار اور سیر و شکار سنگین جرم تھا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا سخت سزا کا مستحق ہوتا تھا یہودیوں نے اس حکم کو توڑنے کے لئے شرعی حیلہ نکال لیا وہ یہ کہ سمندر کا پانی کاٹ کر لے جانے کے لئے انہوں نے بہت سے نالے نالیاں بنائیں اور سنیچر کے دن جب پانی کی سطح پر مچھلیاں آتیں اور اس دن بہت آتی تھیں تو سمندر کا پانی مچھلیوں کے ساتھ ان میں آجاتا پھر دوسرے دن انکا شکار کر لیتے تھے۔ جب مذہب کی روح نکل جاتی اور صرف رسم و رواج کی خانہ پُری رہ جاتی ہے تو دنیا کی ہر قوم اسی طرح شرعی حیلہ نکال کر اللہ کے ساتھ چالاکی کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی قصہ کی کتاب الحیل میں بہت سے حیلے شرعی احکام سے بچنے کے لئے بیان ہوئے ہیں جن میں بعض یہودیوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مہ یہ ان کی سزا کا ذکر ہے۔ ذلت و خواری اور اخلاق و کردار میں پستی کو ذلیل بندر ہو جانے سے بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر انسان کو دو باتوں میں بندر کہا جاتا ہے (۱) نقالی اور (۲) بدکاری۔ یہودیوں میں یہ دونوں باتیں موجود تھیں (۱) شرعی احکام کی صرف نقل باقی رہ گئی تھی۔ ان کی روح اور زندگی میں اس کا اثر ختم ہو چکا تھا۔

(۲) بدکاری بکثرت تھی جس کا تذکرہ بائیبل میں موجود ہے۔ یہاں ذلت و خواری اور اخلاق و کردار کی وہ پستی مراد ہے جس میں انسان ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور سوسائٹی میں اس کو نہایت حقیر و ذلیل سمجھا جانے لگتا ہے یہ پہلے زمانہ میں ایک خاص بستی کے لوگوں کا ذکر ہے اور یہودیوں کی تاریخ کا مشہور واقعہ تھا۔

شرعی حکم پر عمل کرنے میں کٹ حجتی

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ تا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔ کہا میں اللہ کی اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ کوئی غیر سنجیدہ بات کہوں۔ انہوں نے کہا آپ اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ اس گائے کی کچھ تفصیل بتایئے کہا وہ فرماتا ہے ایک ایسی گائے ہونی چاہیئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا (بلکہ) بیچ کی راس ہو۔ بس کر ڈالو جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے لئے یہ اور پوچھ دیجئے کہ اس کا رنگ کیسا ہو کہا وہ فرماتا ہے کہ زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیئے جس کا رنگ شوخ ہو جو دیکھنے والوں کا دل خوش کرتی ہو۔ انہوں نے کہا اپنے رب سے کہئے کہ اور واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو کیونکہ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور پتہ لگانے میں کامیاب ہوں گے۔ کہا وہ فرماتا ہے کہ ایسی گائے ہو جس سے زمین کو جوتنے اور کھیتی کی آب پاشی کا کام نہ لیا جاتا ہو بے عیب ہو۔ اس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ نے ٹھیک پتہ بتایا پھر انہوں نے ذبح کیا حالانکہ وہ ذبح کرنے والے نہ تھے[1]

○

[1] گائے ذبح کرنے کے حکم میں دو باتیں پیش نظر تھیں۔ ایک کا ذکر ان آیتوں میں ہے اور دوسری کا ذکر آگے "وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا ..... الخ" میں ہے۔ پہلی بات گائے کی عظمت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ عرصہ تک مصریوں میں رہنے سہنے کی وجہ سے یہودیوں میں گائے کی عظمت رچ بس گئی تھی بار بار اس کی پرستش سے روکے جانے کے باوجود دلوں میں اس کی عظمت موجود تھی۔ اللہ کی تدبیر نے اس کا راستہ یہ نکالا کہ ایک خاص تقریب میں (جس کا ذکر آگے واذا قتلتم ..... الخ میں آرہا ہے) گائے کی قربانی کا حکم دیا اور ان کی کٹ حجتی و بار بار کے سوالات نے بات کو اسی قسم کی گائے تک پہنچا دیا جس قسم کی گائے کی پرستش کی جاتی تھی۔ چار و ناچار انہوں نے گائے کی قربانی کی۔

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

(۸)

گناہ کی مقدار

اخلاقی اور روحانی اعتبار سے غلطیاں بڑی بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی۔ ان کی کمیت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ خودی کو کتنا آلودہ کرتی ہیں اور منفی طور پر اس کو کتنا متاثر کرتی ہیں۔ کوئی گناہ یا معصیت خواہ بہت چھوٹی ہو، اگر مسلسل کی جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ خودی کے ارتقا کو زک پہنچائے۔ خودی کی محبتِ حسن جوں جوں بڑھتی ہے غیر اخلاقی کام اس کی زندگی سے کم ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کا صدور بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس سطح پر صحیح نصب العین اور اس کی محبت مومن صادق کے شعور پر مکمل طور پر غلبہ پالیتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اسے غلط افکار و اعمال سے اجتناب میں چنداں محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ فطری طور پر اور نہایت سہولت کے ساتھ صرف اخلاقی اور نیک اعمال ہی کا صدور ہوتا ہے۔ غیر اخلاقی اور غیر مستحسن افعال کا ظہور اسی لیے ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا جذبۂ محبت وقتی طور پر غلط سمت پر پڑ جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب حقیقی کی رفعت شان کا پورا ادراک نہیں ہوتا۔

غلط افکار کے منابع

صحیح نصب العین کے ساتھ متصادم باطل افکار کا منبع قوی عادات ہیں یا منہ زور جبلتیں۔

(ا) عادات: جب تک ایک شخص غلط نصب العین کے دام الفت میں اسیر ہے، اس

کی پوری زندگی اس کے زیرِ اثر رہتی ہے۔ نتیجتاً وہ فکر و عمل کی ایسی عادات متشکل کر لیتا ہے جو رفتہ رفتہ بہت پختہ ہو جاتی ہیں اور اس غلط نصب العین کی مقصد براری کرتی ہیں اور اپنی قوّت کے بل پر اس شخص کے جذبۂ محبّت کو سہارا دیتی ہیں۔ یہ عادات اس کے گلے کا ہار بن کر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں خواہ اس کی فطرتِ سلیم کی کچھ رمق ابھی باقی ہو حسن اور صحیح نصب العین کا شعور حاصل ہو جانے اور اس کی محبّت کا وعدہ کر لینے کے باوجود یہ عاداتِ خبیثہ اس کے ذہن و عمل کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ ان سے چھٹکارا بلا واسطہ تصادم سے نہیں بلکہ ان کی جگہ ایسی عادات بنا لینے سے ہوتا ہے جو صحیح نصب العین کے مطابق ہوں۔ جُوں جُوں نئی صالح عادات گہری ہوتی جاتی ہیں، یہ پُرانی غیر صحت مند عادات کی جگہ لے لیتی ہیں یہاں تک کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے نظامِ عبادات میں باقاعدگی اور بروقت عمل پر انتہائی زور دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النّساء:۱۰۳)

ترجمہ: بیشک نماز مسلمانوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے۔

اسی مضمون پر مشتمل مندرجہ ذیل حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَدْوَمُھَا (الحدیث)

ترجمہ: بہترین نیک عمل وہ ہے جسے پابندی اور باقاعدگی سے کیا جائے۔

جب ایک مومنِ صادق صحیح اور مطلوب عادات تشکیل دے لیتا ہے تو یہ عادات اس کی پُوری عملی زندگی کا احاطہ کر لیتی ہیں اور وہ از خود محسوس کرتا ہے کہ اسے نہ صرف اپنی جملہ مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے حقیقی محبوب کی پرستش کرنی ہے بلکہ اپنی پُوری زندگی کے تمام گوشوں میں اخلاقی ضابطے کی بھی پابندی کرنی ہے۔ جس طرح باطل عادات باطل محبّت کا سہارا بنتی ہیں، اسی طرح عاداتِ محمودہ صحیح محبت کو برقرار رکھنے میں ممد ہوتی ہیں۔ ایک خاص کام کو بار بار کرنے سے اس میں ایک گونہ سہولت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ کام از خود اور شعوری کوشش کے بغیر انجام دیا جا سکتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون انسان کی زندگی میں بہت کار آمد ہے۔ اس سے زندگی کے وہ گوشے بھی اخلاقی ضابطے کے تحت لائے جا سکتے

ہیں جن کے بارے میں ابھی فرد نے عادت صحیحہ استوار نہیں کی۔ جب تک عاداتِ خبیثہ کا مکمل خاتمہ کر کے ان کی جگہ نیک عادات پوری طرح قائم نہیں ہو جاتیں، صحیح نصب العین کے لیے جذبۂ محبّت کامل نہیں ہو سکتا۔

(ب) جبلتیں: وہ باطل افکار و خیالات بالخصوص بہت تیز و تند ہوتے ہیں جن کا منبع مختلف جبلتیں ہوتی ہیں مثلاً خورد و نوش کی جبلت، جنسی جذبہ، جارحیت پسندی، خود تحکّمی وغیرہ وغیرہ کیونکہ خاص طور پر وہ جبلتیں جن کا ہدف فرد اور نسل کی صیانت ہوتا ہے، بہت قوی ہوتی ہیں ان کے لیس پردہ ایک قسم کا حیاتیاتی جبر کارفرما ہوتا ہے اور اسی لیے ان کی تکمیل ایک مخصوص لذّت کا باعث بنتی ہے۔ صحیح نصب العین کے لیے محبّت کی عدم موجودگی میں ہم اپنی جبلّتی خواہشات کی لذّت سے اتنے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ہم اسی لذّت کو تمام حسن و عظمت کا محور قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ خواہشات ہی ہمارا مطمعِ نظر اور ہدف یا نصب العین بن جاتی ہیں اور صحیح اور سچے نصب العین کے لیے مخلص محبّت بھی انہی خواہشات کی تکمیل کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ یہ تمام جبلتیں فی نفسہٖ غلط نہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ انہیں حدِ اعتدال کے اندر رکھا جائے۔ اور انہیں اسی حد تک پورا کیا جائے جس حد تک یہ صیانت ذات کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن جب یہ خواہشات اور ان سے حاصل شدہ لذّت اپنی جائز حدود سے تجاوز کر کے انسان کے ذہن و قلب پر پورے طور پر مستولی ہو جائیں تو پھر انسان حیوان کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ کیونکہ جانور بھی انہیں اپنی حیاتیاتی ضرورت سے زیادہ پورا نہیں کرتا۔ ایسے انسانوں کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (الاعراف: ۱۷۹)

ترجمہ: وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ

ان انسانوں کا نصب العین اور الٰہ ان کی خواہشات ہوتی ہیں:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط (الفرقان: ۴۳)

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر بھی نظر کی جس نے اپنی خواہش (نفس) کو اپنا معبود بنا لیا ہے

صاحبِ ایمان کا ایک اہم عمل۔ مجاہدہ مع النفس

ایک ایسے شخص کو جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اپنی خود شعوری اور ایمانی کیفیات کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں خواہشات اور مرغوبات نفس کے ساتھ کشاکش کا سخت تجربہ ہوتا ہے۔ ان خواہشات کو اپنی جائز حدود میں مقید رکھنا اور صحیح نصب العین کے ساتھ عقیدت و محبّت کے جذبات کی نشوونما محنت طلب امر ہے۔ اسے اپنی جبلّی خواہشات کو نہ صرف کنٹرول کرنے بلکہ انہیں دبانے کی اس حد تک مشق ہونی چاہیے کہ وقت آنے پر اور ضرورت کے پیش نظر اپنے عشق کی خاطر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جان کا نذرانہ بھی پیش کر سکے۔ اس صورتِ حال سے وہ ہر اس لمحے میں دوچار ہوتا ہے جب اسے اپنے نصب العین کے مخالف اعمال کا سامنا ہوتا ہے یا جب اسے جہاد فی سبیل اللہ میں بھوک پیاس اور دیگر تکلیف برداشت کرتے ہوئے حصّہ لینا ہوتا ہے اور جس میں وہ اپنی جان تک قربان کر دینا عین سعادت سمجھتا ہے۔

روزہ (صوم) کی اہمیّت

جبلّی و نفسانی خواہشات اور تقاضوں کے ساتھ کشمکش آسان امر نہیں لیکن ایک صاحبِ ایمان کی ان کے خلاف مسلسل کوشش اسے آسان بنا دیتی ہے۔ چونکہ وہ معصوم نہیں ہوتا اس لیے اس سے غلطی و گناہ کا صدور ہو جاتا ہے لیکن وہ ہر بار اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اس سے رجوع کرتا ہے اور پہلے سے زیادہ عزم و ارادہ کے ساتھ اپنے نصب العین کی طرف مثبت پیش قدمی کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا نظامِ عبادات اس داخلی کشمکش میں ثابت قدمی کی مشق بہم پہنچاتا ہے۔ بالخصوص سال میں ایک بار مسلسل ایک ماہ کے روزے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دن کے اوقات میں ایک ماہ کے روزے اسے اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول اور دبانے کی خوب تربیت دیتے ہیں۔ جُوں جُوں وہ روزے کے ذریعے اپنے نفس کی گرفت کو ڈھیلا کرتا ہے۔ اسی قدر حسنِ ازل کے ساتھ حقیقی محبّت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ چنانچہ وہ جس حد تک اپنے نفس کے تقاضوں کو دبا سکتا ہے، اسی قدر نصب العین کے ساتھ محبّت بڑھ سکتی ہے۔

روزے سے حاصل کردہ روحانی ترفع زندگی میں ہر لمحے شیطانی وسوسوں کے خلاف زبردست ڈھال کا کام کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے نفس پر مکمل قابو پاکر اپنے نصب العین کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اور اخروی کامیابی سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔ سفلی جذبات کے چنگل سے نکل کر ہی ایک صاحبِ ایمان اس ذہنی و قلبی کیفیت کا احساس کرسکتا ہے جس میں وہ ہر طرف سے یکسو ہوکر حسنِ ازل سے رشتۂ محبّت استوار کرتا ہے۔ یہ ذہنی و قلبی سکون صرف انہی سعید روحوں کو ملتا ہے جو بالآخر اپنے رب کے انعام یعنی جنّت الفردوس کو پاتے ہیں:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدۃ: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متنفس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ (النّٰزعٰت:- ۴۰-۴۱)

ترجمہ: اور جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا ہو اور اس نے (اپنے) نفس کو (بُری) خواہشات سے روکا ہو، تو یقیناً بہشت ہی اس کا ٹھکانا ہے

پروفیسر جیمز نے اخلاقی عمل کی تعریف ہی یوں کی ہے کہ یہ وہ عمل ہے جسے سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خودی کے ارتقائی مراحل میں وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب اخلاقی عمل کو کم سے کم مزاحمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صحیح نصب العین کے ساتھ محبّت کا دعویٰ عمل کی دنیا میں ہی پرکھا جاتا ہے اور اگر یہ جذبہ صادق ہو تبھی اس میں اعلیٰ مدارج کے حصول کی صلاحیّت ہوتی ہے۔ سفلی اور نفسانی خواہشات کے علی الرغم اخلاقی عمل کو کامیابی سے انجام دینا ہی انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح نصب العین کے ساتھ اپنی محبّت کو پروان چڑھا سکے۔ مشکلات میں صبر و مصابرت انسان کو خواہشات کے مقابلے میں نصب العین کو ترجیح دینے کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ

إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ (البقرۃ : ۴۵)

ترجمہ : اور صبر اور نماز کا سہارا پکڑو ! اور البتہ یہ شاق ہے مگر ان پر (نہیں) جو عاجزی کرتے ہیں۔

صبر کے ساتھ ساتھ اب کریم کے حضور میں دعا و مناجات سے ایک فرد روحانی ارتقا میں حائل موانع اور مشکلات پر قابو پا سکتا ہے۔ شیطان کے وساوس ہر دم اس کا پیچھا کیے رہتے ہیں۔ اور اس صورت میں وہ صرف صبر اور نماز کے ذریعے ہی اپنے نصب العین کی طرف استقامت کے ساتھ گامزن رہ سکتا ہے۔ قرآن مندرجہ ذیل آیات میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ : ۱۵۵-۱۵۶)

ترجمہ : اور ہم تمہاری آزمائش کر کے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے۔ اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آن پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کا طریقہ

غلط خیالات و تصوّرات کی فتح نہ صرف ایک فرد کی نصب العین کے ساتھ عشق و محبّت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ اسی کی ذہنی صحت کے لیے بھی مُضر ہے۔ متعدد اعصابی عوارض (مثلاً ہسٹریا، پریشانی، وہم، خبط اور پاگل پن وغیرہ) کا سبب مریض کے خیالات و خواہشات و اس کے نصب العین میں تصادم ہوتا ہے۔ جب ایک باطل خیال اس کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل بھی کر لیتا ہے۔ تو اگرچہ اسے اپنی وقتی نفسانی خواہش کی تکمیل پر ایک گونہ لذّت کا احساس ہوتا ہے لیکن فوراً بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے

صحیح نصب العین سے دُور ہٹ گیا ہے۔ اس پر سخت ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اور بعض اوقات احساسِ گناہ کی شدّت اس میں ذہنی تصادم اور شکستگی کی کیفیّت پیدا کر دیتی ہے صدقِ دل کے ساتھ کی گئی توبہ ہی اس صورتِ حال کا صحیح واحد حل ہے۔ سچّی توبہ ہی ذہنی تصادم اور اس کے اثرات کو رفع کر سکتی ہے لیکن اگر ایک صاحبِ ایمان روحانی ترفع کے اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے جہاں وہ شیطانی وسوسوں میں گرفتار نہیں ہوتا، تو وہ ان تمام ذہنی عوارض سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

عشقِ الٰہی یا خود آگہی کے ارتقاء کی کوئی انتہا نہیں

انسانوں میں محبّت کی صلاحیّت مختلف ہوتی ہے بعض دُوسرے کو الف یکساں ہوں تب بھی اس کا انحصار کسی فردِ کی ذہانت پر ہوتا ہے۔ اعلیٰ ذہنی سطح کے لوگوں کو حسن ازلی کی جستجو بہت شدید ہوتی ہے اور وہ اس سے ہر چاہت سے زیادہ جذباتی اور گہری محبّت کر سکتے ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان شخص کو اپنی فطری صلاحیّت کے مطابق جذبۂ عشق کو بڑھانا چاہیے۔ جب تک اس کا پورا عمل نصب العین کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہو جاتا، اسے سمجھنا چاہیئے کہ اس کے قلب و ذہن میں ابھی باطل نظریات کا اثر ہے اور وہ اس کے عمل اور جذبۂ محبّت کے کچھ حصّے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اور یہ کہ اسے ابھی مسلسل اپنے جذبۂ محبّت اور عمل کو صحیح نصب العین کے لیے خالص کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی فرد کے حُبِّ الٰہی کا جذبہ اس دنیاوی زندگی میں خواہ کتنا ہی بلند مقام حاصل کر لے، یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ اس نے خالقِ حقیقی کے حسن کا کما حقہٗ ادراک حاصل کر لیا ہے۔ اس جذبہ و شوق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اور کسی سطح پر بھی ایک مومن یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے آخری حد کو چھُو لیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قول مبارک ہے۔

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (حدیث)

ترجمہ: ہم تجھے پہچان نہ سکے۔ جیسا کہ تیری پہچان کا حق ہے۔

جسمانی موت کے بعد بھی خودی کا ارتقا جاری رہتا ہے

یہی وجہ ہے کہ ایک مومن صادق کی محبّتِ الٰہی میں موت کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ جسم کی تخلیق خودی کی خلاقی کا مظہر ہے نہ کہ جسم سے خودی وجود میں آتی ہے، خودی جسمانی موت کے بعد کسی قسم کے تعطل یا عدم وجود کا شکار نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اگلی زندگی میں بھی اپنی فطری بنیادی خصوصیت کے ساتھ باقی رہتی ہے یعنی حسن ازلی کی تلاش اور اس سے محبّت۔ چنانچہ یہ روحانی ارتقاء حیات بعد الممات میں بھی جاری رہتا ہے اور نورِ الٰہی سے کسبِ نور کا عمل بھی ختم نہیں ہوتا۔ صاحب ایمان حضرات اگلی زندگی میں خدا سے دعا کریں گے کہ وہ ان کی خود آگہی کا نور مکمل کر دے اور ان سے وہ موانع دُور کر دے جن کی وجہ سے وہ اپنی پہلی زندگی میں روحانی بالیدگی مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے۔ وہ اپنی ان بداعمالیوں پر اللہ کی جناب میں نادم ہوں گے جن کی وجہ سے وہ دنیا میں حسن ازلی کے ساتھ محبت کا حق نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی دعا یہ ہوگی :-

رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝

(التحریم : ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیئے کامل کر دے اور ہماری مغفرت فرما بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

مومن صادق کی اُخروی زندگی

لیکن وہ مومن صادق جو صحیح نصب العین کے لیے اپنا جذبۂ عشق و محبّت اس دنیا میں آخری حد تک بڑھا سکا اور موت تک اسے برقرار بھی رکھ سکا۔ حیاتِ اخروی میں اسی جذبہ محبّت کے مزید ارتقاء میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرے گا۔ چونکہ دنیوی زندگی میں اس نے اپنے نفس اور شیطان کے تمام وساوس پر قابو پا لیا تھا، اس لیے اب آخرت میں اسے مزید تگ و دو نہیں کرنی۔ حیات دنیوی میں کی گئی محنت سے اس نے وہ نور کما لیا ہوگا جو حیات بعد الممات

کے مراحل میں اس کے کام آئے گا اور اس کے آگے اس کا راستہ منوّر کیے رکھے گا۔ وہ بغیر کوشش کے باری تعالیٰ کے نئے جلوے ہر دَم ملاحظہ کرے گا:

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (الحدید: ۱۲)

ترجمہ: اُن کا نور اُن کے آگے آگے دوڑتا ہوگا۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ط (الحدید: ۱۹)

ترجمہ: اُن کے لیے اُن کا اجر اور اُن کا نور ہے۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (التحریم: ۸)

ترجمہ: اُن کا نور اُن کے آگے دوڑتا ہوگا۔

رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج (التحریم: ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حزن اور خوف سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کو حزن اُس وقت ہوتا ہے جب اسے اس کی مطلوبہ شے نہ ملے اور خوف اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو مقررہ معیار پر آتا نہ دیکھے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں انسانی خودی کی اصل اور بنیادی خواہش ایک ہی ہے اور وہ خواہش حسنِ ازلی کے حصول کی ہے۔ چنانچہ جب اس خواہش کے لوازم دنیوی زندگی میں مسلسل پورے کرتے ہوئے ایک فرد اگلی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی روح اس منزل کی تمام سختیاں جھیلنے کی صلاحیّت رکھتی ہے اور اسے کسی قسم کے حزن یا خوف سے واسطہ نہیں ہوتا:

اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (اٰل عمران: ۱۷۰)

ترجمہ: کہ اُن پر نہ تو کسی قسم کا ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

درحقیقت جنت کی تمام نعمتوں اور ان سے لطف اندوزی کا انحصار اپنی کیفیات پر ہے۔ ایک گناہ گار بندے کا معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ چونکہ وہ دنیوی زندگی میں اپنی فطرت کی آواز پر لبیک کہہ کر اپنی خودی کی تعمیر نہیں کرتا بلکہ معصیتوں اور سیاہ کاری میں ملوّث ہو کر اپنی خودی کو آلودہ کر لیتا ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی اسے سخت حزن و خوف سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر وہ پہلی زندگی

میں معصیتوں کے ارتکاب کے بعد توبہ (اپنی تمام شرائط کے ساتھ) کرکے اپنے گناہوں کا ازالہ کرلیتا ہے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ اسے اگلی زندگی میں ان کا کفارہ بھرنا پڑتا ہے۔ اور جب تک وہ اس سخت تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر اپنی خودی کو آلودگیوں سے پاک نہیں کرتا، اس کا روحانی ارتقاء رُکا رہتا ہے۔ آخرت میں خودی کی تطہیر کا عمل انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوزخ کے عذاب کی مختلف شکلیں اور ان کی تفصیلات اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ (جاری ہے)

oooooooo

بقیہ: نقطۂ نظر

عالمی ذرائع ابلاغ اسلامیہ کا قیام | غیر اسلامی ممالک اسلام کے متعلق جو معاندانہ پروپیگنڈہ مسلسل کرتے رہتے ہیں اس کا جواب دینے اور تبلیغ اسلام کا صحیح اور مؤثر طور پر حق ادا کرنے کے لیے تمام جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال میں لایا جانا چاہیئے تاکہ اسلام کی اشاعت اور پھیلاؤ میں آسانی پیدا ہو۔

اس کے علاوہ عالم اسلام کو قریب تر لانے کے لیے تمام اسلامی ممالک میں ایسے پروگراموں کو نشر کرنے کا انتظام کیا جانا چاہیئے جو کہ تمام اسلامی ممالک کا صحیح صحیح حال اندرونی صُورتحال اور کلچر وغیرہ سے دوسرے اسلامی ممالک کو روشناس کرائیں۔

عربی زبان کی ترویج | اسلام کے صاف اور شفاف سرچشمے قرآن وحدیث کی زبان عربی زبان ہے اسلامی ممالک کے سربراہوں کو اس امر کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ ہر مسلمان کی رسائی براہِ راست اس سرچشمے تک ہو سکے اس سے نہ صرف اتحادِ امت کی جڑوں کی آبیاری ہوگی بلکہ باہمی تعلقات کے لیے ایک بنیادِ مشترک بھی فراہم ہو جائے گی۔

ہمارے نزدیک اتحاد امت کی یہ حقیقی بنیادیں ہیں اور عملاً اتحاد کے لیے کرنے کے یہ کام ہیں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ امت کو اتحاد کی یہ بنیادیں جلد از جلد امت کے طبقات بالخصوص سربراہانِ مملکت اس طرف توجہ دیں اور یہ عملی اقدامات کرکے امتِ مسلمہ کو دنیا میں فیصلہ کن خدائی طاقت بنا دیں۔ آمین۔

حضورؐ پر جادو کا واقعہ

اور

محدّث کشمیریؒ کی توجیہ

مولانا اخلاق حسین قاسمی

سورۂ معوذتین کے شان نزول میں لبید بن اعصم یہودی کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا واقعہ مشہور ہے لیکن بعض مفسرین نے اس واقعہ کو اتنا طول دیکر بیان کیا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور اہل تحقیق نے اس واقعہ کو اسی وجہ سے یا بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا بہت اختصار سے نقل کیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے جادو کی روایت کی پُرزور وکالت کی ہے اور نہایت کمزور استدلال کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

اس واقعہ کو امام بخاریؒ نے کتاب الطب میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے اس روایت کے بارے میں فیض الباری میں لکھا ہے:۔

حضرت عائشہؓ اس جادو کا اثر یہ بیان کرتی ہیں:

حتی کان یری انہ یاتی النساء ولا یاتیھن	یہاں تک کہ آپ خیال فرماتے تھے کہ ازواج مطہرات کے پاس ہو آئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

حضرت عائشہ رضؓ کے ان الفاظ کو یاد رکھا جائے، ان الفاظ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جادو کا تعلق عورتوں کے معاملات سے تھا، شریعت کے معاملات سے نہیں تھا نہ آپ کی ذاتی زندگی کے دوسرے معاملات سے تھا۔

اور اس روایت کے اکثر الفاظ میں ابہام ہے ایک طریقہ میں اطلاق کے ساتھ کہا گیا ہے کہ:

یخیل الیہ انہ یفعل الشی و ما فعلہ۔	آپ خیال کرتے تھے کہ ایک فعل کر لیا حالانکہ وہ نہیں کیا گیا تھا۔

اس اطلاق کو دیکھ کر بعض عُلماء نے ان الفاظ کی تاویل کی یہاں تک کہ امام ابوبکر حصاص نے کتاب الاحکام میں اس حدیث سے بالکل انکار کر دیا اور اسے ملاحدہ کی تصنیف قرار دیا۔ (کتاب الاحکام ج ۱ ص ۵۵)

صحیح وہ ہے جو ہم نے اُوپر کہا کہ یہ معاملہ صرف عورتوں کے معاملات تک تھا یعنی یہ بھول گھر میں عورتوں کے پاس جانے آنے تک محدود تھی۔

(فیض الباری ج ۴ ص ۳۷۲)

شاہ صاحبؒ نے مطلق بھول کے الفاظ کو عورتوں کے معاملہ میں بھول کے ساتھ خاص اور مقید کر کے اسے تسلیم کیا ہے، کیونکہ اگر وہ بھول اور نسیان عام تھا تو پھر تبلیغ و دعوت اور قراءت قرآن کے معاملہ میں بھی اس کا اثر تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ قطعی طور پر ممکن نہیں۔

مولانا مودودی صاحب نے اس بھول کو مطلق ہی رکھا ہے مگر وہ لکھتے ہیں۔

"یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے۔ حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گذر رہی ہے، رہی آپ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا"

(مختصر تفہیم صفحہ ۹۵)

شاہ صاحبؒ اتنا عموم اور اطلاق بھی تسلیم نہیں کرتے، یہ بھی شانِ نبوت کے خلاف ہے کہ آپ کے ذاتی معاملات میں وہ بھول طاری رہی۔ ذاتی معاملات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ شاہ صاحب نے سحر کے اثر (بھول اور ذہول) کی جو توجیہ فرمائی ہے اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جادو کی اکثر روایات حضرت عائشہ رضؓ سے منقول ہیں کیونکہ آپ ازواج مطہرات میں سے ہیں اور ازواج مطہرات ہی کے معاملات اس سحر سے متاثر ہوئے۔

قرآن کریم نے جادو کی اس خاص قسم کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا:-

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ (البقرہ)	وہ ہاروت و ماروت ان یہودیوں کو وہ سحر سکھایا کرتے تھے جو میاں بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرتے تھے۔

حدیث عائشہ صدیقہ رضؓ کے ایک راوی سُفیان فرماتے ہیں:- یہ قسم سحر کی بدترین قسم ہے، — اس کا اشارہ اسی سحر کی طرف ہے جس کا قرآن کریم نے حوالہ دیا ہے۔

حاصل یہ نکلا لبید ابن اعصم نے جو سحر کیا اس کا مقصد حضورؐ کے گھریلو معاملات میں بدمزگی پیدا کرنا تھا۔

یعنی آپ کو یہ خیال ہوتا کہ اپنی بیویوں کے گھر ہو آیا حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے ازواج مطہرات کے اندر شکایت اور خفگی پیدا ہوتی کہ آپ نے اپنی ازواج پر توجہ دینی چھوڑ دی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں مسند احمد کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جادو کا اثر آپ پر چھ مہینہ طاری رہا، حالانکہ حضرت عائشہ رضؓ کی روایت میں مدت کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ اس لئے چھ ماہ کی روایت استناد کے قابل نہیں۔

قرآن کریم اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حضرات انبیاء پر شیطانی اثرات کا تسلط اور قبضہ نہیں[1] ہو سکتا۔ البتہ جب شیطان کا اثر ہوتا ہے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور اس اثر سے نکل جاتے ہیں[2]۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ پر لبید کے جادو کا اثر بہت تھوڑے وقت تک رہا، پھر آپ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معوذتین کی دونوں سورتیں نازل ہوئیں، اور آپ سے وہ اثر زائل ہو گیا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت کو امام احمد نے اپنی مسند میں بروایت ہشام عن امیہ نقل کیا ہے اور اس میں اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں لیکن اس روایت کو محدث ابن کثیر نے مسترد کیا ہے اور اس میں نکارت اور غرابت کا دعویٰ کیا ہے۔

مولانا مودودی نے حضرات انبیاء پر جادو کے اثر کو ممکن ثابت کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ پر جادو کے اثر کی آیات نقل کی ہیں۔

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ۔ (طٰہٰ ۶۶)	جادوگرانِ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے خیال میں جادو کے زور سے یہ بات ڈالی کہ وہ رسیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں

لیکن حضرت موسیٰؑ کا یہ واقعہ یہ امر بھی واضح کر رہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر یہ اثر چند منٹ ہی قائم رہا آپ نے وحی الٰہی کے مطابق جیسے ہی اپنا عصا پھینکا ویسے ہی جادو کا وہ اثر دور ہو گیا اور جادوگروں کی رسیاں جیسی تھیں ویسی ہی نظر آنے لگیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء پر سحر کا اثر زیادہ دیر تک

---

[1] دیکھو آیت ۹۹ سورہ النحل [2] دیکھو آیت ۲۰۱ سورہ الاعراف

قائم نہیں رہتا۔

سب سے پہلے اُردو مفسر حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے موضح قرآن میں لبید ابن اعصم کی روایت کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اسے نقل کریں۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے صرف دو فقروں میں اس واقعہ کا ذکر کیا اور لکھا "سحر کے اثر سے آپ میں مرض کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی"

احکام القرآن کے مصنف ابوبکر احمد ابن علی جصاص بغدادی اپنے عصر وعہد میں حنفیہ کے سرخیل تھے اور آپ کی ذات پر احناف کی امامت اور سیادت ختم ہوگئی تھی۔ آپ نے امام بخاری اور مسلم کی روایت عن عائشہؓ کو بھی سرے سے ملاحدہ (گمراہوں) کی تصنیف قرار دیکر مسترد کر دیا اور یہ آپ کے حسن ذوق کا تقاضا تھا۔ جادو کا یہ واقعہ جس طرح ایک طویل داستان کی شکل اختیار کر گیا ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تقدیس کا صحیح ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اسی لئے امام ابوبکر جصاص نے اس واقعہ کی بالکل نفی کرنی ضروری سمجھی ہے۔

یہ بات الگ ہے کہ بعض غالی روایت پسندوں نے امام صاحب پر معتزلی ہونے کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ حضرات صاحب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدس کے مقابلہ میں راویوں کی روایت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کے تین جھوٹوں والی روایت کے بارے میں اصحاب نقل و روایت کی طرف سے کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی تحقیق

مولانا ابوالکلام آزاد سورۂ معوذتین کی تفسیر تک تو پہنچ نہ سکے البتہ سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں قصہ موسیٰ اور ساحران فرعون پر حسب ذیل

تشریحی نوٹ سپرد قلم فرماتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ ۔ (اعراف ۱۱۵)

پھر جادوگروں نے (جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو ایسا کیا کہ لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردیں اور ان میں (اپنے کرتبوں سے) دہشت پھیلادی اور بہت بڑا جادو بنا لائے۔

نوٹ لکھتے ہیں ۔ جادوگروں کی نسبت فرمایا، لوگوں کی نگاہیں جادو سے ماردی تھیں یعنی جادو کے شعبدوں کی کوئی حقیقت نہیں محض نگاہ کا دھوکا تھا ۔ چنانچہ دوسری جگہ اسے تخیل کی تاثیر سے بھی تعبیر کیا ہے ۔ (۲۰ : ٦٦، نیز آیت ۱۱۷)

میں فرمایا : ما یافکون یعنی ان کی نمائش جھوٹی تھی ۔

جادو کا اعتقاد دنیا کی قدیم اور عالمگیر گمراہیوں میں سے ہے اور نوع انسانی کے لئے بڑی مصیبتوں کا باعث ہوچکا ہے، قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے اس کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا، لیکن افسوس ہے کہ دنیا متنبہ نہ ہوئی اور ازمنہ وسطیٰ کے مسیحی جہل وقساوت نے ہزاروں بے گناہ انسانوں کو زندہ جلادیا ۔ (دوم ۲۶)

سورۂ طٰہٰ آیت (٦٦) یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ ۔ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ یعنی جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ انکی شعبدہ گری کی وجہ سے دیکھنے والا خیال کرنے لگتا کہ سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں چنانچہ آگے کہا ۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سَاحِرٍ وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ۔ یہ جادوگروں کا فریب نظر ہے اور جادوگر کیا ہی تماشا دکھائے، حقیقت کی طرح کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ (دوم ۴۵۲)

قاضی اطہر مبارکپوری

غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں جو اہم عالمی مسائل درپیش ہیں، ان میں غیر مسلموں کے قرآن مجید چھونے، اس کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اِدھر پچھلی چند دہائیوں سے پوری دُنیا خصوصاً یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اسلام فہمی کے لئے براہ راست مطالعہ کا ذوق اور داعیہ بڑھ رہا ہے، اور اس کے اصل منبع و ماخذ یعنی کتاب و سُنّت اور قُدماء کی تصانیف سے اسلامی عقائد و اعمال کی جستجو عام ہو رہی ہے کیونکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مستشرقین اور ان کے ہم ذوق اہل علم نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ خلاف واقعہ یا ناکافی ہے، اس صورتِ حال کے نتیجہ میں یورپ وغیرہ کی عام درسگاہوں میں عربی زبان اور تحقیقات اسلامی کے مستقل شعبے کھل رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آیند اور اُمید افزا ہے کہ خود غیر مسلموں میں اسلامی فہمی کا ذوق، ان کو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بہت قریب کر رہا ہے، ایسی حالت میں ہم مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے اور اسلام فہمی کی راہ میں ان کے لئے آسانی پیدا کی جائے، خاص طور سے ان کے

پاس قرآن پہنچانے اور اس کو صحیح طور سے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔

کئی سال ہوئے بمبئی میں ہمارے پاس جنوبی افریقہ (جوہانسبرگ) سے اس سلسلہ میں لمبا چوڑا استفتاء آیا تھا جس میں یہی سوال تھا کہ ہمارے یہاں کے یورپین اور افریقن ہم سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان میں اسلام فہمی کا شوق حد سے زیادہ ہے، جب سے یہاں کے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار ہوا ہے اور ان کی بستیوں میں اسلامی اور دینی فضا پیدا ہو رہی ہے غیر مسلموں میں یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں ہم ان غیر مسلموں کو پورا قرآن یا اس کے اجزاء مع ترجمہ کے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں ہم نے اس وقت لکھا کہ قرآن کا ترجمہ دیا جا سکتا ہے، اور اسی وقت سے اس مسئلہ میں مزید تحقیق و تلاش جاری رہی۔

حالات کی تیز رفتاری اور ضرورت کی شدت نے بڑی حد تک قرآن کریم کو غیر مسلموں کے ہاتھ میں پہنچا دیا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کو پڑھنے اور سمجھنے لگے ہیں، ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تعلیم ہو رہی ہے اور دراساتِ اسلامیہ کا شعبہ قائم ہے، ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جائے،

قرآن مجید کے ادب و احترام پر ہر مکلف مسلمان کا عقیدہ و عمل ہے، اور عام مسلک یہی ہے کہ محدث اور جنبی مسلمان اور غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے، البتہ محدث یعنی بے وضو مسلمان اس کو پڑھ سکتا ہے،

اس سلسلہ میں سورۂ واقعہ کی یہ آیات قابل توجہ ہیں جن کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں،

فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ	سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے
وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ	چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی

عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ
فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗ
اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

قسم ہے کہ یہ ایک مکرّم قرآن ہے
جو محفوظ کتاب میں ہے، اس کو
بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ
نہیں لگانے پاتا ہے، یہ ربّ
العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؛

جمہور صحابہؓ، تابعین اور سلف کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" اس قرآن کے بارے میں ہے جو عند اللہ اور آسمان میں ہے، اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، یعنی اس آسمانی کتاب الٰہی کو صرف فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں، سورہ عبس کی ان آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ
صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ
مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ
كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

سو جس کا جی چاہے اس کو قبول
کرلے، وہ ایسے صحیفوں میں ہے
جو مکرّم ہیں، رفیع المقام ہیں،
مقدّس ہیں، جو ایسے لکھنے والوں کے
ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مقرب بیک ہیں

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور مجاہد، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جُبیر ابوشعثاء، جابر بن زید، ابونہیک، ابوالعالیہ، قتادہ، حماد بن سلیمان، اسماعیل سدّی، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

دوسرے علماء کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" میں مطہرون سے مراد جنابت اور حدث سے پاک لوگ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کو جُنبی اور مُحدِث ہاتھ نہ لگائے، ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں اگرچہ خبر دی گئی ہے مگر اس کا مطلب و معنی طلب ہے اور قرآن کریم سے مراد مصحف ہے جو لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

پاس قرآن پہنچانے اور اس کو صحیح طور سے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے۔

کئی سال ہوئے بمبئی میں ہمارے پاس جنوبی افریقہ (جوہانسبرگ) سے اس سلسلہ میں لمبا چوڑا استفتاء آیا تھا جس میں یہی سوال تھا کہ ہمارے یہاں کے یورپین اور افریقن ہم سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان میں اسلام فہمی کا شوق حد سے زیادہ ہے، جب سے یہاں کے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار ہوا ہے اور ان کی بستیوں میں اسلامی اور دینی فضا پیدا ہو رہی ہے غیر مسلموں میں یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں ہم ان غیر مسلموں کو پورا قرآن یا اس کے اجزاء مع ترجمہ کے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں ہم نے اس وقت لکھا کہ قرآن کا ترجمہ دیا جا سکتا ہے، اور اسی وقت سے اس مسئلہ میں مزید تحقیق و تلاش جاری رہی۔

حالات کی تیز رفتاری اور ضرورت کی شدت نے بڑی حد تک قرآن کریم کو غیر مسلموں کے ہاتھ میں پہنچا دیا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کو پڑھنے اور سمجھنے لگے ہیں، ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تعلیم ہو رہی ہے اور دراساتِ اسلامیہ کا شعبہ قائم ہے، ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، اور کتاب و سنت اور سلف صالحین کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جائے،

قرآن مجید کے ادب و احترام پر ہر مکلف مسلمان کا عقیدہ و عمل ہے، اور عام مسلک یہی ہے کہ محدث اور جنبی مسلمان اور غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے، البتہ محدث یعنی بے وضو مسلمان اس کو پڑھ سکتا ہے،

اس سلسلہ میں سورۂ واقعہ کی یہ آیات قابل توجہ ہیں جن کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں،

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ	سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے
وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ	چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی

عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ
فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗ
اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

قسم ہے کہ یہ ایک مکرّم قرآن ہے
جو محفوظ کتاب میں ہے، اس کو
بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ
نہیں لگانے پاتا ہے، یہ ربّ
العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؛

جمہور صحابہؓ، تابعین اور سلف کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" اس قرآن کے بارے میں ہے جو عند اللہ اور آسمان میں ہے، اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، یعنی اس آسمانی کتاب الٰہی کو صرف فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں، سورہ عبس کی ان آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ
صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ
مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ
كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

سو جس کا جی چاہے اس کو قبول
کرلے، وہ ایسے صحیفوں میں ہے
جو مکرّم ہیں، رفیع المقام ہیں،
مقدّس ہیں، جو ایسے لکھنے والوں کے
ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مقرب بیک ہیں

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور مجاہد، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جُبیر ابوشعثاء، جابر بن زید، ابونہیک، ابوالعالیہ، قتادہ، حماد بن سلیمان، اسماعیل سدّی، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

دوسرے علماء کا قول ہے کہ "لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" میں مطہرون سے مراد جنابت اور حدث سے پاک لوگ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کو جُنبی اور مُحدِث ہاتھ نہ لگائے، ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں اگرچہ خبر دی گئی ہے مگر اس کا مطلب و معنی طلب ہے اور قرآن کریم سے مراد مصحف ہے جو لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقہ میں قرآن لے کر سفر کرنے سے اسلئے منع فرمایا ہے کہ دشمن اس کو پا جائے گا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے عامل حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو مکتوب روانہ فرمایا تھا اس میں درج تھا۔ "اَن لا یمس القرآن الا طاھر" یعنی قرآن کو صرف طاہر و پاک شخص ہاتھ لگائے۔ [1]

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے کہا کہ جو کتاب تم لوگ پڑھ رہے تھے مجھے دو، تو بہن نے کہا کہ: "انک رجس وانہ لا یمسہ الا المطھرون" یعنی تم ناپاک ہو اور اس کو پاک ہی لوگ ہاتھ لگاتے ہیں: "فقم فاغتسل او توضا فتوضا ثم اخذ الکتاب فقرأہ" یعنی تم اٹھو غسل یا وضو کرو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے وضو کیا اور قرآن کو پڑھا، دوسری روایت میں غسل کرنے کی تصریح بھی ملتی ہے، چنانچہ قاضی ابن عربی مالکیؒ نے احکام القرآن میں "واغتسل واسلم" لکھا ہے۔ [2]

حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک مرتبہ بغیر وضو کے قرآن پڑھا مگر اس کو ہاتھ نہیں لگایا، حضرت سعدؓ نے اپنے لڑکے کو قرآن چھونے کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا، حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے، اور امام حسن بصریؒ، امام نخعیؒ بغیر وضو کے مس قرآن مکروہ سمجھتے ہیں۔ [3]

فراءؒ نے سب سے الگ اور ظاہری معنی سے ہٹ کر کہا ہے آیت "لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ" کا مطلب بیان کیا ہے کہ لایجد طعمہ ونفعہ الا من امن بہ [4]، قرآن کی چاشنی اور لذت اور اس کا نفع وہی شخص پائے گا جو اس پر ایمان لائے۔

---

[1]: تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸ [2]: احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۲

[3]: احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۵۱۱ [4]: تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب کہ قرآن کی لذت وہی لوگ پا سکتے ہیں جو گناہوں سے پاک اور تائب و عابد ہیں صحیح ہے، امام بخاری نے اس کو مختار بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی لذت اس شخص نے پائی جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اور دین اسلام کی حقانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر راضی ہوا، مگر یہ توجیہہ بغیر عقلی اور سمعی دلیل کے ظاہر سے عدول ہے، [1]

قاضی ابوبکر احمد بن علی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ مذکورہ آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر آیت کو خبر پر محمول کیا جائے تو اولیٰ یہ ہے کہ اس میں وہ قرآن مراد ہو جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، اور اگر آیت کو نہی پر محمول کیا جائے اگرچہ یہ بصورت خبر ہے تو ہم سب کے بارے میں عام ہوگی، اور یہی اولیٰ ہے اس لئے کہ صریح روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کے پاس جو تحریر روانہ فرمائی تھی اس میں "ولا یمس القرآن الا طاھر" تھا۔ اور یہ نہی اسی آیت کی وجہ سے ہوگی کیونکہ اس میں نہی کا احتمال ہے [2]

یہ ساری بحثیں مسلمان محدث اور جنبی کے مس قرآن کے بارے میں ہیں جو مکلف ہیں اور جن پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں اسی کے ساتھ قرآن جہاں "ھدی للمتقین" ہے وہیں "ھدی للناس" بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین تک قرآن کی آواز پہنچانے میں جو جد و جہد فرمائی ہے اور اس راہ میں جو مصائب برداشت کئے ہیں ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں، دربار رسالت میں جو وفود دین فہمی کے لئے آئے ہیں، ان کے لئے جو اہتمام

---

[1] احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۱

[2] احکام القرآن ج ۳ ص ۵۱۱

آپؐ نے فرمایا ہے وہ بھی معلوم ہے، اُن کی دلداری، پذیرائی اس لئے تھی کہ وہ خود دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے آتے تھے، حتیٰ کہ جو حربی مشرک اور کافر قرآن سننے اور سمجھنے کے ارادے سے آتے تھے ان کو اپنی امان میں رکھ کر قرآن سنانے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے :

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ، ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝	اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ چاہے تو آپ اس کو پناہ دیدیں تاکہ وہ کلام اللہ کو سن لے، پھر اس کو اس کی پناہ کی جگہ پہنچا دیں، یہ حکم اس لئے ہے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے،

امام ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافر جب ہم سے دین کی حجت اور توحید و رسالت کے دلائل طلب کرلے، تاکہ حجت اور دلیل کی روشنی میں توحید و رسالت کو تسلیم کرلے، تو ہم پر اقامتِ حجت اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے اور ایسے حربی کافر کا قتل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کو امان دینے کا حکم دیا ہے تاکہ کلام اللہ کو سنے، اس کے بعد لکھتے ہیں :

وفيه الدلالة ايضاً على ان علينا تعليم كل من التمس منا تعريفه شيئاً من امور الدين، لان الكافر الذي استجارنا ليسمع كلام الله انما قصد التماس معرفة	نیز اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ہم سے دین کی کوئی بات معلوم کرنا چاہے ہم پر ایسے تمام لوگوں کو تعلیم دینا فرض ہے، کیونکہ جس کافر نے کلام اللہ سننے کے لئے ہم سے پناہ و امان چاہی ہے اس کا مقصد دین کی

صحۃ الدّین ، [1] صحت کی معرفت ہی ہے ۔

موجودہ دَور میں بہت سے غیر مُسلموں کے بارے میں تقریباً یہی صورت حال ہے کہ وہ تحقیق کے لئے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں ، اور گویا ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو قرآن کی تعلیمات اور توحید و رسالت کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی جائیں اس لئے ان کی پذیرائی ، دلداری اور تالیف قلب کے ساتھ اسلام کے اصل منبع و ماخذ تک ان کے لئے راہ پیدا کرنی چاہیئے ۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے غیر مُسلم کے مسِ قرآن کا مسئلہ سامنے آتا ہے ، ظاہر ہے کہ عام حالات میں غیر مُسلم کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے ، جب کہ وہ اپنے طور پر قرآن چھوتے اور پڑھتے ہیں ۔ چنانچہ امام ابوبکر جصّاص رحؒ نے مشہور تابعی امام ابوقتادہ بن دعامہ سدوسی بصری رحؒ متوفی ۱۱۷ھ کا یہ بیان نقل کیا ہے :

وقال قتادہ : لا یمسّہ عند اللہ الا المطھّرون فاما فی الدُّنیا فانہ یمسّہ المجوسی ، والنجس والمنافق [2] ۔	جو قرآن عنداللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں اور جو دنیا میں ہے اس کو مجوسی اور ناپاک اور منافق بھی چھوتا ہے ۔

امام ابن کثیر رحؒ نے بھی حضرت قتادہ کا یہ قول معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے :

لا یمسّہ عند اللہ الا المطھّرون فاما فی الدُّنیا فانہ یمسّہ المجوسی النجس والمنافق الرجس [3] ۔	جو قرآن عنداللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے اور جو دُنیا میں ہے اس کو نجس مجوسی اور ناپاک منافق بھی چھوتا ہے ۔

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۳ ۔ [2] احکام القرآن جصّاص ج ۳ ص ۱۱۵

[3] : تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸ ۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صورت حال کی خبر اور بیان واقعہ کے طور پر ہے، یعنی ان کے زمانہ میں بصرہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں جو غیرمسلم اور مجوسی وغیرہ آباد تھے اور مسلمانوں سے ان کا اختلاط تھا۔ وہ اپنے طور پر بوقت ضرورت قرآن کو ہاتھ لگانے اور پڑھتے تھے، جیسا کہ آج بھی یہ صورت ہے کہ غیرمسلم طابعین وناشرین قرآن مجید کی طباعت کرتے ہیں، اور ایسے ادارے اپنے طور پر اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام سے پہلے مصحف کو ہاتھ لگانے کے لئے جو وضو یا غسل کیا تھا ظاہر ہے کہ وہ بحالت کفر تھا اور اس کا مقصد ظاہری صفائی اور ستھرا پن تھا، غالباً اسی ظاہری صفائی کے پیش نظر ائمہ احناف میں امام محمدؒ نے غسل کے بعد نصرانی کے مس قرآن کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ درمختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسّہ	مس قرآن سے نصرانی کو روکا جائیگا
وجوزہ محمد اذا اغتسل[1]	اور امام محمدؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ وہ غسل کرلے،

نیز اسی زمانہ میں کوفہ کے بعض اجلّہ تابعین اور ائمہ دین نے نصاریٰ سے اپنے لئے قرآن لکھوایا تھا، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے نصاریٰ کی ظاہری صفائی پر اعتماد کرکے یہ کام ان سے لیا تھا، چنانچہ امام ابراہیم نخعیؒ اپنے استاد امام علقمہ بن قیس نخعی کوفیؒ متوفی ۶۲ھ کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

انہ کان اذا اراد ان	جب ان کو مصحف کی ضرورت
یتخذ مصحفاً امر	پڑتی تو ایک نصرانی کو حکم کرتے
نصرانیاً فنسخہ[2]	اور وہ اُن کے لئے لکھدیا کرتا تھا

---

[1] : درمختار مع الشامی ج ۱ ص ۱۸۳

[2] : المحلی ابن حزم ج ۱ ص ۸۴

اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علقمہؒ اس عیسائی کاتب سے بار بار مصحف لکھوایا کرتے تھے، اور اس پر ان کو پورا اطمینان تھا۔

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ علماء ربانیین میں سے تھے، حضرت عمر حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد، حضرت حذیفہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور علم و عمل، سیرت و کردار میں ان کے مثنیٰ تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں حضرات صحابہؓ شریک ہو کر دینی سوال کرتے اور فتویٰ پوچھتے تھے[1]

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کوفی متوفی ۸۳ھ نے مقام حیرہ کے ایک نصرانی سے اُجرت پر قرآن کی کتابت کرائی تھی، مصنف عبدالرزاق باب بیع المصاحف میں ہے:

ان عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کتب له نصرانی من اهل الحیرة مصحفاً بسبعین درهماً[2]	عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے لئے حیرہ کے ایک نصرانی نے ایک مصحف ستر درہم میں لکھا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کوفہ کے کبار تابعین اور ثقات اسلام میں سے ہیں، ایک سو بیس[120] صحابہ کی صحبت و معیت سے فیضیاب ہیں، ان کے حلقۂ درس میں بھی حضرات صحابہؓ تشریف لاتے تھے۔ جن میں حضرت براء بن عازبؓ بھی ہوا کرتے تھے، یہ حضرات نہایت خاموشی اور ادب کے ساتھ ان سے احادیث سنتے تھے، وہ مشہور امام محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے والد ہیں[3]

ان حضرات کے اس عمل پر معاصر ائمۂ دین کی طرف سے کسی قسم کی نکیر کا پتہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۷۳

[2] مصنف عبدالرزاق ج ۸ ص ۱۴۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۶۰

نہیں چلتا، حالانکہ اس دور میں ہر جگہ علماء و فقہاء، اور محدثین کا جم غفیر موجود تھا اور مختلف فیہ مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ نصرانی کاتب سے قرآن لکھوانے میں اس کی ظاہری پاکی و صفائی کا لحاظ رہتا رہا ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ میں بھی بات تھی، اور ایسی صورت میں وہ نصرانی کاتب قرآن کو چھوتے اور پڑھتے تھے،

اس کے باوجود عہد سلف میں بلا کسی شرط و قید ہر محدث و جنبی اور غیر مسلم کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانے اور پڑھنے کے جواز میں کوئی صریح قول نہیں ملتا۔ البتہ حضرت قتادہؒ کا قول " فاما فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی والنجس و المنافق" بتاتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں قرآن کو غیر مسلم بھی ہاتھ لگاتے تھے۔ بعد میں پانچویں صدی کے مشہور ظاہری امام و عالم ابن حزم اندلسیؒ متوفی ۴۵۶ھ بلا کسی قید و شرط کے علی الاطلاق اس کے جواز کے قائل ہیں اور محدث، جنبی اور کافر و مشرک سب کے لئے قرآن چھونے اور پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور عدم جواز کے تمام دلائل کا رد کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

جنبی کے لئے مس قرآن کو ناجائز قرار دینے والوں نے جن آثار سے استدلال کیا ہے، ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ یا مرسل ہے، یا غیر مستند صحیفہ ہے، یا اس کا راوی مجہول ہے۔ یا ضعیف ہے۔ [۱]

اور اپنے اس قول کے استدلال میں مکتوب نبوی بنام ہرقل کو پیش کیا ہے جس میں قرآنی آیات ہیں اور نصاریٰ نے ان کو ہاتھ لگایا اور پڑھا ہے، یہ مکتوب مبارک صحیح بخاری کتاب بدء الوحی میں یوں درج ہے:

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد عبد اللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدیٰ،

---

[۱] المحلی ج ۱ ص ۸۱ -

اما بعد فانی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم یوتك
الله اجرك مرتين ، فان توليت فان عليك اثم الاريسين
ویاآھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم
ان لانعبد الا الله ولا نشرك به شیئاً ، ولا یتخذ بعضنا
بعضاً ارباباً من دون الله ، فان تولوا فقولوا اشهدوا
بانّا مسلمون ٥"

اس مکتوب نبوی کو نقل کرکے ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے نصاریٰ کے پاس یہ مکتوب روانہ فرمایا جس میں یہ آیت ہے : حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ وہ اس مکتوب کو ہاتھ لگائیں گے ۔ [1]

اس مکتوب کے پیش نظر بعض علماء حنبلی کے لئے ایک دو آیات پڑھنے اور دشمن کے ملک میں قرآن کے بعض اجزاء بھیجنے اور اس کے ساتھ سفر کرنے کے قائل ہیں ، [2]

غیر مسلم کو قرآن کی تعلیم دینے کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں:
حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے کافر کو قرآن کی تعلیم سے مطلقاً منع کیا ہے ۔ حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے ، امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو اقوال ہیں : اور بعض مالکی علماء نے غیر مسلم پر دین کی حجت قائم کرنے کے لیے قرآن کی مختصر تعلیم جائز قرار دی ہے اور ضرورت سے زیادہ تعلیم سے منع کیا ہے انہوں نے مکتوب نبوی بنام ہرقل سے استدلال کیا ہے ، آخر میں لکھا ہے کہ :

وقد نقل النووی	امام نوویؒ نے نصاریٰ وغیرہ کے
الاتفاق علی جواز	پاس اس قسم کے خط لکھنے پر

---

[1] :- فتح الباری جلد ۱ صـ۳۹

[2] :- المحلی ۱۷ صـ۸۳

الکتابة الیھم یمثل بذلک [۱] — علماء کا اتفاق نقل کیا ہے۔

حنفیہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ غیر مسلم کے لئے قرآن کی تعلیم مطلقاً جائز سمجھتے ہیں، دُرِّ مختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسّہ، وجوّزہ محمّد اذا اغتسل، ولا باس بتعلیمہ القرآن والفقہ عسیٰ ان یھتدی [۲] — نصرانی کو مس قرآن سے روکا جائیگا، اور امام محمدؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں جب کہ وہ غسل کرلے اور اس کو قرآن اور فقہ کی تعلیم دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے ہدایت پا جائے۔

علمائے ہند میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے غیر مسلم کو صرف ترجمۂ قرآن دینا جائز قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن مجید کا حکم رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لئے دینا جائز ہے [۳]

الحاصل غیر مسلم کے ہاتھ میں قرآن کریم دینے اور اس کو قرآن کریم کی تعلیم دینے کے بارے میں (۱) حضرت عمرؓ کا اسلام لانے سے پہلے غسل یا وضو کے بعد قرآن کا چھونا اور پڑھنا (۲) مکتوب نبوی بنام ہرقل (۳) حضرت قتادہؒ کا بیان، (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ اور حضرت علقمہ بن قیسؒ کا نصرانی سے قرآن لکھوانا (۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا قول (۶) احناف کے نزدیک غیر مسلم کی ہدایت کی اُمید پر اس کو قرآن کی تعلیم دینے کا جواز، (۷) امام ابن حزم ظاہری

---

[۱] فتح الباری ج ۶ ص ۱۳۴ [۲] درالمختار ج ۱ ص ۱۸۳

[۳] کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۲۵

اندلسیؒ کے نزدیک علی الاطلاق سب کے لئے مس قرآن کا جواز، ان سب تصریحات کی روشنی میں ایسے غیر مسلموں کے قرآن چھونے اور پڑھنے پر سنجیدگی سے غور کیا جاسکتا ہے جو واقعی ہدایت کے طالب ہیں، اور اس کا اپنے طور پر احترام کرتے ہیں، ایک بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور علقمہ بن قیس نے نصرانی سے قرآن لکھوایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد سربراہان ملک کے پاس دعوتی مکاتیب روانہ فرمائے مگر نصرانی سربراہ ہرقل کے مکتوب میں قرآنی آیات تحریر فرمائیں، امام محمد نے نصرانی کو غسل کے بعد قرآن چھونے کی اجازت دی ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے اہل مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے، اور قرآن کا کسی حد تک احترام کرتے تھے اس لئے اہل علم کو ان پر اعتماد تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ قتادہؒ، عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰؒ، علقمہ بن قیسؒ اور امام محمدؒ علمائے عراق میں سے ہیں جن کے یہاں نومسلموں اور غیر مسلموں کے اختلاط و اجتماع کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے، اور آئمہ دین ان کو کتاب و سنّت کی روشنی میں اپنی فقہی بصیرت سے حل کرتے تھے، اس دور میں عراق کے مرکزی شہر کوفہ، بصرہ وغیرہ عجمی و عربی رجال و افکار کا گہوارہ تھے، اور ان میں مذہبی بحث و مناظرہ کی مجلسیں برپا رہا کرتی تھیں، اسی وجہ سے علماء عراق جدید مسائل کے بارے میں سند اور اُسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں توسّع پایا جاتا ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ "برہان" دہلی)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حافظ محمد سلیمان (ایم ایڈ)

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے "مجھے ان لوگوں سے پیار ہے جن کی گردن پر چھری چل رہی ہے۔" حضرت شاہ صاحب موصوف کا یہ اعلان کردہ رویہ اتباعِ سنّت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کمزور طبقات کے لئے رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فکرمندی (Concern) سیرت پاک کا اہم ترین پہلو ہے۔ جس طرح ہمارا خدا رب العالمین تو لاریب ہے۔ لیکن (جیسا کہ آپؐ نے طائف سے واپسی پر ایک نہایت ہی دل گداز دعا میں ارشاد فرمایا) ربّ المستضعفین بالخصوص ہے۔ ایسے ہی حضور سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم رحمۃ للعالمین تو بے شک ہیں اور آپؐ کی رحمت اس پوری کائنات میں سب کے لئے ہے۔ لیکن حفیظ تائب کے بقول آپؐ بالخصوص ضعیفوں کی قوت اور غریبوں کی ثروت ہیں۔ عہدِ حاضر میں خاص کر سنّت نبویؐ کے اہم ترین سبق ـــــ غمِ انسانیت۔ پر زور دینے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت اس لئے بھی ہے کہ افتادہ و درماندہ طبقات کے دلوں میں بہتر زندگی کے لئے امیدوں کا ایک طوفان بداماں مچل پیدا ہو چکی ہے اور چونکہ ہمارے نام نہاد اسلامی معاشروں میں مصائبِ انسانی سے لاتعلقی اور سنگدلانہ حد تک بےحسی کا چلن ہے۔ کمزوروں کی مجبوریوں کا ظالمانہ استحصال عام ہے۔ بھرے کو بھرا جاتا ہے اور مرے کو اور مارا جاتا ہے۔ اس لئے کمزور طبقات (یا قرآنی اصطلاح میں مستضعفین) کسی بھی طالع آزما کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

اس حقیقت پر کہ آپؐ بے سہاروں کا سہارا اور بے آسراؤں کا آسرا ہیں، سب سے پہلی شہادت آپؐ کے بزرگ چچا، مربّی اور سرپرست حضرت ابوطالب کی ہے۔ وہ

ایک نعت میں فرماتے ہیں :

وہ گورے مکھڑے والا
جس کے روئے زیبا کے،
واسطے سے ابرِ رحمت کی،
دعائیں مانگی جاتی ہیں ؎
وہ — یتیموں کا سہارا
وہ — بیواؤں کا سرپرست

(ترجمہ جناب نعیم صدّیقی صاحب مصنّف محسنِ انسانیت)

دوسری شہادت آپؐ کی اوّلین رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی ہے۔ وہ آپؐ کو مخاطب کر کے فرماتی ہیں۔ " میں دیکھتی ہوں آپؐ اقربا پر شفقت فرماتے، سچ بولتے، رانڈوں، یتیموں اور بےکسوں کی دست گیری کرتے، مہمان نوازی فرماتے اور —— مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔" (رحمۃ للعالمین جلد اوّل مصنّفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری)

حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی محترم شخصیتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ دیگر تمام شخصیتوں سے زیادہ آپؐ کا واسطہ رہا۔ ایک شخصیت نے کم وبیش بیالیس سال تک آپؐ کی سرپرستی، نگہبانی اور حفاظت فرمائی اور دوسری شخصیت نے پچیس برس تک آپؐ کے ساتھ مثالی رفاقت نبھائی۔ ان دونوں ہستیوں کے ساتھ آپؐ کا تعلق کتنا گہرا تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ سنہ نبوی کو جس میں حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے تین دن کے وقفہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے وفات پائی۔ سیرت کی کتابوں میں عام الحزن (غم کا سال) کا نام دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب یہ دونوں بزرگ شخصیتیں ایک ہی نکتہ پر زور دیتی ہوں کہ آپؐ بےکسوں کے دستگیر اور بے نواؤں کا آسرا ہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سیرتِ پاک کا اہم ترین پہلو غمِ انسانیت ہے۔ اور آپ کی سنّتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا سب سے ضروری سبق گرتے ہوؤں کو تھامنا اور

کمزوروں کو سہارا دینا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم واقعاتی شہادت حِلفُ الفُضُول میں آپؐ کی فعّال شرکت ہے۔ اس وقت عمر مبارک بیس برس سے بھی کم تھی۔ مکّہ کے چند دردمند اور سلگتے ہوئے دل رکھنے والے اصحاب نے آپؐ کے توجّہ دلانے پر ظلم کے سدّباب، بے امنی کے خاتمہ اور غریبوں کی امداد کے لئے ایک انجمن بنائی۔ حلف الفضول اس انجمن کا منشور تھا۔ اس حلف کے چند الفاظ یہ تھے:

"اللہ کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ (یا مٹھی) بن جائیں گے اور یہ ہاتھ اس وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا ہوا رہے گا جب تک کہ سمندر گھونگھوں کو بھرتا رہیگا۔"

آپؐ نے بعد میں ایک مرتبہ فرمایا:

"میں عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں حلف لینے میں شریک تھا اور سرخ اونٹوں کے گلے کے عوض بھی اس شرکت کے اعزاز سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا اور اگر اب زمانۂ اسلام میں بھی مجھے کوئی اس کی دہائی دے کر پکارے تو اس کی مدد کو دوڑ کر جاؤں۔ (پیغمبرِ اعظمؐ و آخر مصنفہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر)

حلف الفضول میں آپؐ کی شرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں:

"حلف الفضول میں شرکت آپؐ کا اوّلین سنگِ میل ہے ..... یہ آپؐ کے دلِ دردآشنا کی آواز تھی۔"

عنفوانِ شباب میں حلف الفضول میں شرکت فرما کر مستضعفین کے لئے فکرمندی کے جس جذبہ کا اظہار آپؐ نے فرمایا۔ وہ جذبہ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری لمحہ تک آپؐ کی جدّوجہد میں ایک پورے تسلسل کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ عرب کے اس وقت کے معاشرہ میں عورتوں اور غلاموں کی حالت بالخصوص قابلِ رحم تھی ـــــ حجّۃُ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے جو وصیتیں فرمائیں ان میں خاص طور پر عورتوں سے حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی اور وصال مبارک سے صرف چند لمحے پہلے نماز کی پابندی کے علاوہ غلاموں کا خیال رکھنے کی وصیت بھی فرمائی۔ آپ کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فرمان یہی تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اسی ارشاد (اَلصَّلٰوۃَ اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ) کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی بار دہراتے رہے (رحمۃ للعالمین جلد اوّل مصنفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری) فاضل مؤرخ کا بیان ہے کہ پھر نزع کی حالت طاری ہوگئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے فی الحقیقت اسلام کا خلاصہ اور روح ہے۔ جو عبدیت و اخوت کے تصورات کا حسین امتزاج ہے۔ ان تصورات کا عملی اظہار کیف حضوری اور غم انسانیت کی جذباتی کیفیات میں ہوتا ہے۔ حضوری کی کیفیت کے حصول کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ اسے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بندے اور خدا کی سرگوشی قرار دیا ہے۔ آپؐ کو نماز سب سے زیادہ مرغوب تھی۔ اسے آپؐ نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور مومن کا معراج بھی فرمایا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ بندہ اپنے اللہ سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ حضرت بلالؓ کو آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ بلالؓ! (نماز کے لئے بلوا۔ اذان ۔ دے کر) ہمیں راحت پہنچا" ——— (اَرِحْنَا یا بلالؓ) حضرت مولانا ادریس صاحب انصاری نے رسالہ "میری نماز" میں نقل فرمایا ہے۔ "حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ گھر میں تشریف لاتے اور گھر والوں سے بے تکلفی سے باتیں فرماتے رہتے لیکن جب اذان کی آواز آتی اور نماز کا وقت ہوتا تو ہمہ تن نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور ہم سے ایسے بے تعلق ہو جاتے جیسے کہ پہلے سے ہماری اور آپؐ کی کوئی شناسائی ہی نہیں۔ گویا کہ ہم اور آپؐ بالکل ہی اجنبی ہیں اور آپؐ اور ہم میں کوئی پہچان ہی نہیں۔"

نماز کے ساتھ اس رغبت اور اس میں اتنی محویت کے باوجود یہ بھی روایت ہے کہ جب آپؐ نماز پڑھا رہے ہوتے اور مقتدی صحابیات رضی اللہ تعالےٰ عنہن میں سے کسی کے بچے کے رونے کی آواز سنتے تو (بچے کی تکلیف اور اس کی والدہ کی پریشانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے) نماز مختصر فرما دیتے۔ (روحِ سلام مصنفہ سید امیر علی)

حضوری کی اعلیٰ ترین کیفیت میں دکھی انسانیت کا یہ لحاظ! سبحان اللہ! یہ وہ مثالی خدا رسیدگی ہے جس کی تعلیم اُس نے دی ہے جو تعلق باللہ کے حوالہ سے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھا۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی خدا رسیدگی، کوئی ایسا تعلق باللہ اور حضوری کی کوئی ایسی کیفیت جس میں غم انسانیت کی گنجائش نہ ہو سنّتِ نبویؐ کی روشنی میں سراسر نامعتبر اور غیر مطلوب ہے۔ میر تقی میر نے شکایت کی تھی ؎

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا،
ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ

بہرحال ایسی "بے حقیقت خدا رسیدگی" جس کا بندے کے درد دل سے کوئی تعلق نہ ہو اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شکستہ حال، بے سروسامان اور مصیبت زدہ انسانیت کے ساتھ احسان کو اسلام (بقول سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ) "اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس بزرگ و برتر کی ذات اس سے کہیں بلند ہے۔" موصوف کے فرمانے کے مطابق اس تصوّر کی ایک اچھوتی تصویر کشی ایک حدیث قدسی میں یوں کی گئی:

"خداوند عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا "اے ابن آدم! میں بیمار پڑا تو تو میری عیادت کو نہ آیا۔" ابن آدم جواب دے گا "پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے"۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تُو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔" (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا کھلانے کو کہا تو تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔" وہ کہے گا "پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک ٹھہرا۔؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اسے کھانا کھلا دیا ہوتا تو اس (کھانے) کو میرے

پاس پالیتا۔" (پھر اللہ تعالےٰ فرمائے گا) "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا تو تُو نے مجھے پانی نہ پلایا۔" وہ کہے گا "پروردگار! میں تجھے پانی کیسے پلاتا جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟" (اس پر ارشاد ہوگا) "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی درخواست کی تھی تو تُو نے اسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو اس (پانی) کو میرے پاس پالیتا۔" (اسلام میں عدلِ اجتماعی مصنفہ سید قطب شہید مترجم جناب نجات اللہ صاحب صدیقی)

اس حدیثِ قدسی کے ہوتے ہوئے تعجب ہے کہ بعض اوقات خدا کی مشیت کے حوالے سے مصائبِ انسانی سے لاتعلقی اور بے حسی کے رویہ کی نظریاتی توثیق کی جاتی ہے۔ میرے ایک نہایت ہی فاضل دوست ایک دفعہ بڑے سرسری انداز میں کہنے لگے "بھئی یہ سارا جھگڑا ہی فضول ہے۔ یہ سب کچھ تو خدا کی مشیت کا کیا دھرا ہے اور معاشی مسئلے کا اسلامی حل یہی ہے کہ ہم سب موجودہ صورتِ حال پر راضی برضا رہیں۔" یہ واضح طور پر خدا کی مشیت اور اس کی رضا کے تصورات کو گڈمڈ کرتا ہے۔ اس کائنات میں خدا کی مشیت کے بغیر کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بالکل بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی مشیت یہی تھی کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت واقع ہو لیکن اس بات کو یزید کی شقاوت اور اس کے ظلم کا جواز بنا لینا کسی طرح بھی روا نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے فاضل دوست اور ان کے دیگر ہم خیال اصحاب بُرا نہ مانیں تو یہ عرض کیا جائے کہ کفارِ مکہ کا رویہ بھی ہو بہو یہی تھا۔ سورہ یٰسین کی آیت ۴۷ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ جب ان کفار سے یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہیں رزق دیا گیا ہے اس میں سے کچھ (اپنے نسبتاً کم خوش قسمت بھائیوں پر) خرچ کرو تو وہ کہتے ہیں: اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ "کیا ہم ان لوگوں کو کھانے کو دیں جنہیں اگر خدا چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دے دے۔" (ترجمہ عبدالماجد دریابادی)

یہ سنگ دلانہ رویہ جاہلیتِ قدیمہ کے علمبرداروں کے ساتھ خاص نہیں۔ وہ جاہلیت جدیدہ جسے لبرل ازم کہا جاتا ہے جس کا امام آدم سمتھ ہے۔ اس کی تعریف آندرے املوک

نے یوں کی ہے "لبرل ازم کیا ہے! یہ کہ آدمی کو دریا میں پھینک دو اور کہو کہ اب تم ڈوبو یا تیرو، یہ تمہاری مرضی۔"
(منقولہ اردو ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۲ء)

فرق صرف اتنا ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے علمبردار (اور غیر شعوری طور پر ان کے پیروکار، دورِ حاضر میں اسلام کے بزعمِ خود غلط جاہل اور بے حس مدعی) مصائبِ انسانی کی نظریاتی توثیق خدا کی مشیت کے حوالہ سے کرتے تھے یا کرتے ہیں، اور جاہلیتِ جدیدہ کی ایک شکل لبرل ازم میں یہ نظریاتی توثیق بہتر معاشی کارکردگی کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ جہاں تک حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا تعلق ہے، اُن کے حوالہ سے مطلوب رویہ اس سے بالکل مختلف ہے، اور یہ رویہ انسان دوستی کا ہے۔ ہمیں کبھی نہ کبھی یہ فیصلہ ضرور کرنا ہوگا کہ ہم نے گرتے ہوؤں کو تھامنے کی سنتِ نبویؐ کا اتباع کرکے پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو آگے بڑھانا ہے۔ یا کفارِ مکہ اور آدم سمتھ کی پیروی میں مصائبِ انسانی سے لاتعلقی اور بے حسی کے رویہ کو جاری رکھنا ہے۔ اور اس طرح بقول اقبال "فطرت کی سخت تعزیروں" کا مستحق بننا ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ جلد اور مؤثر طور پر کرنا ہوگا۔ کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ اب زیادہ مہلت باقی نہیں رہ گئی ہے اور جیسا کہ محترمہ سائرہ ہاشمی نے فرمایا ہے: "وقت کا تازیانہ ہمارے جسم سے صرف ایک ساعت کے فاصلے پر ہی تو آکر رکا ہوا ہے۔"

بقیہ : ہدایت القرآن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کی قومی زندگی کا یہ وہ وقت تھا جبکہ آپریشن کے ذریعہ فاسد خون نکال دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر زخم بھرنے والی دواؤں سے کام نہیں چلتا ہے۔ اس حکم کے ذریعے اللہ نے گائے کی عظمت کو ان کے دل سے کھرچ پھینکنے کا راستہ دکھایا کہ جب تک اس کی عظمت دلوں میں موجود رہے گی دوسرے احکام (زخم بھرنے والی دواؤں) کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہو سکے گا۔

ایسے موقع پر قوم کی کس طرح دلجوئی کی ضرورت ہوتی ہے اور قائدین کو کس تحمل و برداشت سے کام لینا پڑتا ہے اس کا نمونہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طرزِ عمل میں دکھایا گیا ہے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(۸)

حکمتِ اقبال

فلسفۂ خودی کی تشریح ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی

شارحین اقبال کا کام لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ اقبال نے کیا کہا ہے لیکن جب تک وہ یہ نہ بتائیں کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ معلوم اور مسلّم عقلی اور علمی معیاروں کے مطابق صحیح اور درست ہے وہ اس کام کو پوری طرح سے انجام نہیں دے سکتے۔ اگر ہمارے نزدیک اقبال کے افکار قابلِ قدر یا قابلِ قبول ہیں تو اس لیے ہیں کہ وہ علم اور عقل کے پیمانوں کے مطابق معیاری اور درست ثابت کیے جا سکتے ہیں اور درست ثابت ہو کر رہیں گے۔ اقبال کسی الہام کا مدعی نہیں اس کا دعویٰ فقط یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ علمی اور عقلی طور پر صحیح ہے اور کسی تصوّر کا عقلی طور پر درست ہونا اس کے سوائے اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ ان تمام تصوّرات کے ساتھ مناسبت و مطابقت رکھتا ہے جو عقلی و علمی طور پر درست مانے جا سکتے ہیں صحیح تصوّرات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ عقلی و علمی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے کے مؤید ہوتے ہیں لہٰذا وہ تصوّرات کا ایک ایسا مجموعہ بناتے ہیں جس کے اندر کوئی غلط تصوّر داخل نہیں ہو سکتا۔ ہم اس مجموعہ سے کوئی تصوّر نکال کر اس کی جگہ کسی غلط تصوّر کو نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو وہ تصوّر اس مجموعہ سے غیر متعلق اور الگ تھلگ نظر آئے گا اور اس کی وجہ سے مجموعہ کے منطقی تسلسل میں دراڑ پیدا ہو جائے گا جو آشکار طور پر نظر آئیگا لہٰذا کسی تصوّر کے درست ہونے کا معیار یہ ہے کہ ہم بتا سکیں کہ وہ فی الواقع دوسرے تمام درست تصوّرات کے ساتھ علمی اور عقلی مناسبت یا مطابقت رکھتا ہے اور اس کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا تصوّر ان کے ساتھ اس قسم کی کوئی مطابقت یا مناسبت نہیں رکھتا۔ اقبال کے تصوّرات، صحت اور معقولیّت کے اس معیار پر پورا اُترتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ انسانی، حیاتیاتی اور طبیعاتی علوم

آخر کار اقبال کے تصورِ خودی پر مبنی ہو جائیں اور خودی کی تشریح اور تفسیر قرار پائیں تصورِ خودی کی یہ تشریح اور تفسیر علم کی آج تک کی ٹھوکروں کا مداوا اور آج تک کی بے راہ روی کا علاج ہو گی جس کے لیے نوعِ انسانی ہمیشہ کے لیے اقبال کی شکر گزار ہو گی۔ بعد میں حقیقتِ انسان و کائنات کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا جائے گا وہ خواہ اس کا تعلق علم کے کسی شعبہ سے ہو خود بخود اس نظامِ افکار کا جزو بنتا چلا جائے گا یہی مطلب اقبال کا ہے جب وہ لکھتا ہے :

"تاہم یہ یاد رہے کہ تحقیقِ علم و حکمت کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی۔ جوں جوں علم ترقی کرتا جائے گا اور فکر کے نئے نئے راستے کھلتے جائیں گے۔ ان ہی مطالب کی تشریح کے لیے اور تصورات اور غالباً بہتر تصورات میسّر آتے جائیں گے ہمارا فرض ہے کہ ہم انسان کی علمی ترقیوں کا جائزہ لیتے رہیں اور اپنے نظریۂ حیات پر قائم رہتے ہوئے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتے رہیں۔"

ان معروضات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اقبال پر لکھنا ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی تک پوری طرح سے اس پر لکھنے کا آغاز بھی نہیں ہوا اور جب اس پر لکھنے کا آغاز ہو گا تو پھر اس پر لکھنا صرف اس وقت ختم ہو گا جب ہم انسان اور کائنات کے متعلق کسی پہلو سے بھی اور کچھ جاننے سے مجبور ہو جائیں گے اور ظاہر ہے کہ جب تک انسان اس کرۂ ارض پر موجود ہے یہ وقت کبھی نہیں آسکتا اس کا مطلب یہ ہے کہ جُوں جُوں وقت گزرتا جائے گا اقبال کے فلسفۂ خودی کی معقولیت اور جاذبیت زیادہ سے زیادہ آشکار ہوتی جائے گی۔ لہٰذا مستقبل کا انسان جس قدر اقبال کی عظمت کا معترف ہو گا آج کا انسان نہیں ہو سکتا ایک سچے تصورِ حقیقت پر قائم ہونے والے نظامِ حکمت کی ہر ترقی اس کی اگلی ترقی کو آسان کرتی ہے اور اس طرح سے اس کی غیر متناہی ترقیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے جب اقبال کے فلسفۂ خودی کی ایک اور ترقی یافتہ صورت اس کی منظم تشریح کی شکل میں ہمارے سامنے آئے گی تو پھر وہ اور ترقی کرے گا اور لوگ تا قیامت اس پر لکھتے رہیں گے اور اس کی ترقیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا کیوں کہ علم کے تینوں شعبوں میں دریافت ہونے والے تمام حقائق صرف اسی کے اجزاء و عناصر شمار ہوں گے۔

فلسفۂ خودی کے مقابل تمام فلسفے مٹ جائینگے

فلسفۂ خودی کی پہلی منظم تشریح کے ظہور سے کچھ عرصہ کے بعد اس تشریح کی اور توسیع کی ضرورت پیش آئے گی اور پھر کچھ مدت کے بعد اس دُوسری تشریح کی مزید توسیع کی ضرورت لاحق ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس اُوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے ایک سچا فلسفہ ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور اس کی ترقیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں اس کے برعکس چونکہ علمی حقائق ایک غلط فلسفہ کے ساتھ جو غلط تصورِ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے مطابقت نہیں رکھتے لہٰذا ان حقائق کی ترقی کی وجہ سے زود یا بدیر ایک ایسا وقت خود بخود آجاتا ہے جب غلط فلسفہ کی فرضی معقولیت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور وہ اپنا دم توڑ دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فکرِ اقبال کی اس قسم کی منظم تشریح ایک ایسے دَور کو قریب لائے گی جب دنیا میں صرف ایک ہی فلسفہ باقی رہے گا اور وہ اقبال کا فلسفۂ خودی ہو گا اور دوسرے تمام فلسفے یا تو کلیتہً مٹ جائیں گے یا پھر نوعِ انسانی کے ادوارِ جہالت کی یادگار کے طور پر باقی رہیں گے یہی سبب ہے کہ اقبال دَورِ حاضر کے انسان سے نہیں بلکہ مستقبل کے انسان سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ پُوری طرح سے اس کی عظمت کا اعتراف کرے گا اور اس کے فکر کو اپنی عملی زندگی کی بنیاد بنائے گا یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اس کے فکر نے وہ آہوئے تاتار فتراک میں باندھا ہے جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آیا اس کے باغ کی زینت وہ سبزہ ہے جو ابھی اُگا نہیں اور اس کا دامن ان پھولوں سے بھرا ہوا ہے جو ابھی شاخ ہی میں پوشیدہ ہیں

فکرم آں آہوئے فتراک بست
کو ہنوز از نیستی بیروں نجست
سبزہ نادیدہ زیب گلستم
گل بشاخ اندر نہاں در دامنم

اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاعرِ فردا کہتا ہے اور اپنے آپ کو ایسا نغمہ سمجھتا ہے جسے زخمہ ور کی حاجت نہیں اور جو سازِ کائنات سے خود بخود بلند ہونے والا ہے وہ کسی آنے والے زمانہ میں اپنی روشن کی ہوئی آگ (نارِ عشق) کے اُن پجاریوں کا منتظر ہے جو ابھی سو

رہے ہیں اور نیند سے اس وقت اُٹھیں گے جب جہالت کی تاریکیوں کی رات کٹ جائے گی اور سچّی حکمت کی صبح کا نور پھیلنے لگے گا چونکہ اقبال کو معلوم ہے کہ اس کا فلسفۂ خودی نوعِ بشر کی علمی ترقیوں کے ایک خاص دَور میں ہی پُوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ پُوری قبولیت حاصل کرسکتا ہے اور اپنی پوری شان وشوکت سے جلوہ گر ہوسکتا ہے لہٰذا وہ اپنے ہم عصروں سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ اس کی قدر کرسکیں گے چونکہ اس کی لَے کی سُر نرالی ہے۔ اس کا ہم عصر اس کے نغمہ کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے زمانہ کے لوگ رموزِ حیات سے ناواقف ہیں لہٰذا دَورِ حاضرہ وہ بازار ہی نہیں جہاں اس کے یوسف کے خریدار پائے جاسکیں اس کا نغمہ کسی اور جہان سے تعلق رکھتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا اور اس کی جرس کسی اور ہی کاروان کو حرکت میں لانے والی ہے۔

بلکہ عود فطرتم نادر نواست — ہم نشین از نغمہ ام ناآشنا است
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم — من نوائے شاعر فرداستم
انتظار صبح خیزاں مے کشم — اے خوشا زردشتیانِ آتشم
عصر من دانندۂ اسرار نیست — یوسف من بہر ایں بازار نیست
ناامیدستم زیارانِ قدیم — طور مے سوزد کہ مے آید کلیم
نغمۂ من از جہانِ دیگر است — ایں جرس را کاروانے دیگر است

فلسفۂ خودی کی اہمیّت اور عظمت کا دعویٰ صحیح ہے

اپنے فکر کی اہمیّت اور عظمت کا یہ دعویٰ جو اقبال نے بار بار اپنے اس قسم کے اشعار میں کیا ہے۔ درحقیقت خودی یا جوہرِ انسانی کے اوصاف کا ایک علمی اور عقلی نتیجہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے اقبال جوہرِ انسانی کے اوصاف کو معنی آدم کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح سے جب وہ ارتقاء کی قوتوں کے نہ رُکنے والے عمل سے انسان کی عملی زندگی میں آشکار ہوں گے تو انسان کی زندگی جس کی موجودہ غیر متوازن حالت دل میں کھٹکتی ہے ہر لحاظ سے موزوں اور تسلّی بخش ہوجائے گی، یہاں تک کہ نوعِ انسانی اپنے حسن وکمال کی اس انتہا پر پہنچ جائے گی جس کا اس

وقت ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ہم اقبال سے کیا پوچھیں خود فطرتِ انسانی اس کے دعویٰ کی صداقت پر گواہ ہے۔

یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت مے خلد موزوں شود روزے

لہٰذا اقبال کا یہ دعویٰ اس کے فلسفہ کا جزو لاینفک ہے اگر اقبال اپنے فلسفہ کے اس اہم جزو کے متعلق اس لیے خاموش رہتا کہ اس کے اظہار سے اس کی اپنی ستائش کا پہلو نکلتا ہے تو وہ گویا اپنے تصورِ خودی کی حقیقت کو بہ تمام و کمال بیان کرنے سے قاصر رہ جاتا جو اسے کسی قیمت پر قابلِ قبول نہ ہو سکتا تھا لہٰذا جو لوگ اقبال کے اس دعویٰ کو بے کار اور بے معنی نہیں سمجھتے وہ حق بجانب ہیں لیکن آج تک جو کچھ اقبال پر لکھا گیا ہے اس سے اقبال کے اس دعویٰ کی عقلی اور علمی بنیادیں آشکار نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ اقبالی ادب کے حاصلات سے مطمئن نہیں۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اپنی کتاب "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" میں جو ۱۹۵۵ء میں چھپی تھی لکھتے ہیں:

"فلسفۂ خودی پر اب تک کوئی جامع اور مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی۔ اقبال کی وفات کو آج ۷ سال ہوتے ہیں مگر اب تک ان پر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا:

"گو کلامِ اقبال کے متعلق مضامین کی فہرست بظاہر طویل ہے لیکن اس کی عظمت اور بلندی کی نسبت سے اب بھی بہت تشنہ اور مختصر ہے۔"

اس پر قاضی احمد میاں اختر لکھتے ہیں:

ہر وہ شخص جس نے اقبالیات کی تعداد کے ساتھ ہی ان کی نوعیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ساتھ اتفاق کریگا کہ اب تک اقبالیات کے نام سے جو ذخیرۂ ادب تیار ہو چکا ہے وہ اس پایہ کا نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے اور جس سے اقبال کے مطالعہ میں کافی مدد مل

کے اکثر تحریرات ایک دوسرے کی نقل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین اقبال کو ان پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا ہے اب ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں کوئی عملی اور ٹھوس کام کیا جائے اور اس میں ایسے اصحاب فکر و نظر حصہ لیں جو اقبال شناسی میں امتیازی درجہ رکھتے ہوں"۔

لیکن اگر اقبال کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو ان لوگوں کے اقوال اقبال نافہمی کے ایک مضحکہ خیز مظاہرہ سے کم نہیں جو کہتے ہیں کہ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ اقبال کے افکار میں سے کون سے مر گئے ہیں اور کون سے زندہ ہیں یا جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال پر لکھنے کا زمانہ اب ختم ہو گیا ہے۔

فلسفۂ خودی کی منظم اور مکمل تشریح کی خصوصیات

ان حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ضروری ہے کہ فلسفۂ اقبال کی منظم و مکمل تشریح خصوصیات ذیل کی حامل ہو۔

اوّل: ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے مسلسل اور مربوط نظام حکمت کی شکل میں ہو جس میں اقبال کے تمام تصوّرات جو اس وقت اس کی نظم یا نثر کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں خواہ وہ کسی موضوع یا مطالعہ سے تعلق رکھتے ہوں ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اور اقبال کے مرکزی تصوّرِ خودی کے ساتھ عقلی اور عملی رشتہ میں منسلک ہوں۔

دوئم: ضروری ہے کہ اس کے اندر طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کے تمام ایسے حقائق جن کو آج تک سائنسدانوں اور فلسفیوں نے دریافت کیا ہے اور جو اقبال کے تصوّرات کے ساتھ مناسبت اور مطابقت رکھتے ہیں اپنے مناسب نتائج اور مضمرات کے سمیت اقبال کے تصوّرات کی تائید اور توثیق اور تشریح اور توسیع کے لیے سموئے ہوئے موجود ہوں۔

سوئم: ضروری ہے کہ اس کا مرکزی اور بنیادی تصوّر اقبال کا تصوّرِ خودی ہو جس کی اصل خدا کا وہ تصوّر ہے جو نبوّتِ کاملہ کی تعلیمات نے پیش کیا ہے۔ اور اس کے دوسرے تمام تصوّرات خدا کے اسلامی تصوّر کی تشریح اور تفسیر کے طور پر ہوں لہٰذا اس میں جا بجا قرآن کی آیات اور احادیث کو اقبال کے تصوّرات کی تائید اور توضیح کے لیے پیش کیا گیا ہو۔

چہارم: ضروری ہے کہ وہ تمام متداول اور رائج الوقت غلط قسم کے طبیعاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی فلسفوں کی ایسی تردید پر مشتمل ہو جو صحیح حقائق کو غلط حقائق سے الگ کر کے اور غلط حقائق کو درست حقائق بنا کر اقبال کے فلسفۂ خودی کے اندر سموتی ہو گویا وہ فلسفۂ طبیعات، فلسفۂ حیاتیات اور فلسفۂ نفسیات کی تعمیر جدید کی شکل میں ہو۔

اقبال کا فلسفہ عالم انسانی کے عالمگیر نظریاتی مرض کا صحت بخش ردِّ عمل ہے

جب ایک جسم حیوانی میں کسی مرض کے جراثیم داخل ہو کر بڑھتے اور ترقی کرتے ہیں یہاں تک کہ اس میں مرض کی حالت پیدا کر دیتے ہیں تو زندگی کی رو جو حیوان کے اندر بہہ رہی ہوتی ہے (جو درحقیقت اسے پیدا کرتی اور نشوونما کے سارے مرحلوں سے گزار کر جسمانی یا حیاتیاتی کمال تک پہنچاتی ہے) فوراً ان جراثیم کے خلاف ایک ردِّ عمل کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیوان کے جسم کے اندر جراثیم کے زہر کا تریاق یا فاذ زہر پیدا ہونا شروع ہوتا ہے جسے ماہرین علم الابدان اینٹی ٹاکسنز (ANTI TOXINS) یا اینٹی باڈیز (ANTI BODIES) کہتے ہیں یہ فاذ زہر متواتر پیدا ہوتا اور ترقی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور ان کا زہر بھی باقی نہیں رہتا اور ان کی بجائے یہ تریاق جسم میں باقی رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے مرض کا دوسرا فوری حملہ ممکن نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اب یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ کسی مرض کے خلاف کوئی حفاظتی یا مدافعتی تدبیر اس سے زیادہ کارگر اور مؤثر نہیں ہو سکتی کہ بدن میں مرض کی حالت مصنوعی طور پر پیدا کر کے قدرت کو اس کے خلاف ردِّ عمل کرنے اور اس کا تریاق پیدا کرنے کا موقع دیا جائے بعض امراض کے حفاظتی ٹیکے اسی اصول پر ایجاد کیے گئے ہیں پوری نوعِ انسانی کی صورت میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے زندگی کی رو جس نے حضرتِ انسان کو ایک جونک کی حالت سے ترقی دے کر جسمانی اور حیاتیاتی کمال تک پہنچایا ہے اور اس کی نسل کو لاتعداد خطرات سے بچا کر اور ترقی اور فروغ دے کر دنیا کے کناروں تک پھیلایا ہے وہی اس کو نفسیاتی اور نظریاتی کمال کے اس مقام تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے جو درحقیقت اس کی ساری کاوشوں اور محنتوں کا مدعا اور مقصود ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے انبیاء کے ایک طویل سلسلہ کے ذریعے سے نوعِ بشر کی روحانی اور نظریاتی حفاظت و تربیت کا ایک

نہایت ہی معقول اور تسلی بخش انتظام کیا تھا جس کے اثرات چاروں طرف کرۂ ارض پر پھیل گئے تھے لیکن اب جب کہ نبوّت ختم ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے مغرب کے غلط حکیمانہ تصوّرات تعلیم نبوّت کے اثر کو جو اب تک نوعِ انسانی کی نظریاتی اور روحانی صحت کا ضامن تھا ختم کر رہے ہیں۔ ان غلط تصوّرات نے خطرناک نفسیاتی جراثیم کی طرح نوعِ انسانی کے شعور میں گھس کر ایک عالمگیر جسمانی وبائی مرض کی طرح ایک نفسیاتی یا نظریاتی وبائی مرض پیدا کر دیا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب نوعِ انسانی اس مرض کی وجہ سے نظریاتی طور پر ہمیشہ کے لیے مُردہ ہو جائے گی لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ زندگی کی رو جو درحقیقت خدا کے ارادہ کے عمل کا نام ہے اپنے مقاصد کے حصول پر قادر ہے اور انہیں ضرور پا کر رہتی ہے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(خدا اپنے مقصد پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔)

ارتقا کی پوری سرگزشت بتاتی ہے کہ بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی زندگی کے مقاصد میں حائل نہیں ہو سکتی۔ ذرا ان بے شمار خطرناک آسمانی حادثات اور ہولناک زمینی تباہیوں کو ذہن میں لائیے جن کا سامنا زندگی کو سب سے پہلے ایک خلیہ کے حیوان سے لے کر آج تک کے مہذّب انسان کے ظہور تک کرنا پڑا ہے، ہر آن یہ گمان ہوتا تھا کہ زندگی ہمیشہ کے لیے کرۂ ارض سے نیست و نابود ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا خود غاروں کے اندر اور درختوں کے اُوپر پناہ لینے والے کمزور، نہتے اور بے بس انسان کی نسل کا جنگلی درندوں کے لشکروں سے بچ نکلنا قدرت کا ایک معجزہ ہے جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ زندگی اپنے مقاصد کے حصول میں کسی سے شکست نہیں کھا سکتی۔ چونکہ نوعِ انسانی نے نہ صرف کرۂ ارض پر زندہ رہنا ہے بلکہ اپنے روحانی کمال کو بھی پہنچنا ہے لہٰذا ممکن نہیں تھا کہ زندگی کی رو عالم انسانی کے اس ہمہ گیر نظریاتی مرض کے خلاف کامیاب ردِّ عمل نہ کرتی جو مغرب کے غلط تصوّرات نے پیدا کر دیا ہے، زندگی کا یہ ردِّ عمل حکمتِ اقبال کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ جسم حیوانی کے صحت بخش ردِّ عمل کی طرح یہ ردِّ عمل بھی برابر ترقی کرتا رہے یہاں تک کہ کرۂ ارض سے غلط تصوّرات کا زہر نیست و نابود ہو جائے اور نوعِ انسانی اپنی نظریاتی صحت کی طرف پوری طرح

سے لوٹ آئے۔ زندگی کی رَو کا نہ ٹلنے والا تقاضا یہ ہے کہ عالمِ انسانی نظریاتی موت سے بچ جائے اور صحت یاب ہو کر پھر ارتقا کی راہوں پر چل نکلے۔ اس وقت آدم خاکی حالت زوال میں ہے، کیونکہ وہ غلط نظریات کے زیرِ اثر ارتقا کی راہوں سے ہٹ گیا ہے اور نہایت سُرعت کے ساتھ پستی کی طرف لڑھکتا چلا جا رہا ہے اسے فوری علاج کی ضرورت تھی جو زندگی نے خود اپنے صحت بخش ردِّ عمل کے ذریعہ سے اقبال کے فلسفۂ خودی کی صُورت میں پیدا کیا ہے ضرُوری ہے کہ یہ ردِّ عمل برابر بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جائے اور اس سے پیدا ہونے والے صحت بخش مواد (ANTI BODIES) جو اقبال کے سچے معقول اور یقین افروز تصوّرات کی شکل میں ہیں یہاں تک ترقی کریں کہ انسانی سوسائٹی کے جہنّم کے کونے کونے میں پھیل جائیں اور مضر اور مہلک تصوّرات کے اثر کو ناکام بنا دیں لہٰذا یہ صرف یہ ضروری ہے کہ خود قدرت کے اپنے اہتمام کے ساتھ فلسفۂ اقبال کی پہلی مکمل اور منظم تشریح وجود میں آئے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تشریح متواتر ترقی اور توسیع پاتی رہے یہاں تک کہ تمام نفسیاتی، حیاتیاتی اور طبیعاتی حقائق علمی کو اپنے اندر جذب کر لے اور اپنی معقولیّت کی کشش کی وجہ سے آخر کار پورے عالمِ انسانی کے شعور پر حاوی ہو جائے۔

اقبال کو بجا طور پر اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا یہی سبب ہے کہ وہ کہتا ہے:

پس از من شعر من خوانند و مے رقصند و مے گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(جاری ہے)

بیرونِ ملک خریدارانِ حکمتِ قرآن نوٹ فرمالیں!

ماہنامہ "حکمتِ قرآن" کے بیرونِ ملک کے تمام سالانہ خریدار حضرات کے خریداری نمبر تبدیل ہو گئے ہیں۔ براہِ کرم اپنا نیا خریداری نمبر "حکمتِ قرآن" کے لفافے سے نوٹ کر لیجئے!

نقطۂ نظر

قاضی ظفرالحق

اتحادِ امّت کی حقیقی بنیادیں

امت کا مزاج

یہ امت اپنے خصائص و امتیازات میں دیگر اقوام و ملل سے قطعاً مختلف ہے دیگر خصائص و امتیازات کیساتھ اس کی ایک خصوصیت جو اختلاف کا بنیادی سبب ہے اس کی اتحادِ امۃ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اتحادِ نوعِ انسانی کی خواہش اور تمنا ہے جو اس کا خمیر گوندھتے ہوئے اس میں کثرت سے ملا دی گئی تھی۔ چنانچہ اس امت نے ہمیشہ اختلاف و افتراق کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور اس کی چودہ سو سالہ تاریخ میں متعدد تحریکیں اور افراد اتحاد کے داعی بن کر اٹھے اور انہوں نے تفرقہ و اختلاف کی مذمت کرنے اور اتحاد کی سعی و کوشش کرنے میں اپنی جانیں کھپادیں ان میں ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور جمال الدین افغانیؒ کے نام بہت تابندہ ہیں۔ مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ امت میں تفرقہ پیدا بھی ہوا اور اس نے امت کو سخت نقصان بھی پہنچایا اور آج بھی اتحاد کی کوششوں کے علی الرغم تفرقے اور اختلافِ سیئہ و مذموم نے امت کی ہوا اکھیڑ رکھی ہے جس کے سبب سے دنیا کی آبادی کا یہ پانچواں حصہ اپنا کردار، مثبت اور صالح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے۔

امت کا فرضِ منصبی اور اس کا تقاضا

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝

یہ امت خیر امت اور امت وسط بنا کر اس لیے مبعوث کی گئی ہے تاکہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کرکے شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرے۔ امرِ معروف اور نہیِ منکر کے لیے اتحاد ازحد ضروری ہے اسی لیے اس کا تاکیدی حکم دینے کے ساتھ ہی اختلاف سے یہ کہہ کر سختی سے روک دیا گیا کہ

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔

سورہ شوریٰ میں اقامتِ دین کا حکم ارشاد فرما کر انتہائی تاکید کے ساتھ تفرقہ فی الدین سے روک دیا گیا۔

ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔

ان تصریحات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک تو امت کا مزاج تفرقہ و اختلاف سے بیزاری ہے دوسرے امتِ مسلمہ کا فرض منصبی تفرقے سے پرہیز اور اتحاد و اتفاق کی تلقین کرنا ہے اور اس کی ادائیگی اتحادِ امت پر ہی موقوف ہے۔ دنیا آج حیرانگی و درماندگی کے ایسے موڑ پر کھڑی ہے کہ اسے اپنا راستہ سجھائی نہیں دے رہا اور وہ راستے کے تعین کرنے میں یا تو غلطی کر بیٹھی ہے یا پھر صحیح اور غلط میں تمیز کی قوت کھو بیٹھی ہے۔ اس صورتحال سے اگر دنیا کو کوئی نکال کر صراطِ مستقیم اور نجات کی راہ دکھا سکتا ہے تو یہی امت ہے۔ جو اگر اپنے فرض منصبی کی ادائیگی بحسن و خوبی کرے تو تباہی اور بربادی کے غار میں جاتی ہوئی دنیا سلامتی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

چنانچہ امت کا فرض منصبی جس کی حقیقی اور احسن ادائیگی امت کے حقیقی اتحاد پر موقوف ہے۔ آج ہم سے اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم امت مرحومہ کی صحیح اور مضبوط بنیادوں پر شیرازہ بندی کریں اور اس کے داخلی اور خارجی وسائل بروئے کار لاکر اسے دنیا میں ایک فیصلہ کن طاقت بنا دیں تاکہ نہ صرف یہ کہ ہم اپنا فرضِ منصبی ادا کر سکیں بلکہ امت کو دنیا میں سربلند و ذیشان کر سکیں۔

وقت رواں کے اس تقاضے کو امت کے تقریباً سب ہی فہیم عناصر سمجھ رہے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اس تقاضۂ وقت کو پورا کرنے کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ اس سلسلے میں بعض افراد اور حلقوں کی طرف سے کچھ تجاویز بھی آئی ہیں جو یقیناً لائق تحسین اور قابل توجہ ہیں مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر کو پیش کرتے وقت صورتِ واقعہ کا صحیح لحاظ نہیں رکھا گیا ایک تو اختلاف کا اصل سبب جو یقیناً تقویٰ اور اسلامی شعور کا فقدان ہے اس پر توجہ نہیں دی گئی دوسرے زیادہ تر اتحاد کی بات مذہبی اختلافات کے خاتمے یا ان کی موجودگی میں اتحاد کرنے کی تلقین تک محدود ہے تیسرے غیر ارادی اور شاید لاشعوری طور پر اتحاد کی تجاویز کو ملکی پیمانے تک محدود کر دیا گیا ہے حالانکہ امتِ مسلمہ تمام ممالک و اقوام میں پھیلی ہوئی کائی کا نام ہے اور اس وقت یہ مرحوم امت جس صورتحال سے دوچار ہے اس کا تقاضا ہے کہ امت زندگی کے تمام میدانوں میں شیرازہ بندی کرے جو دنیا میں اس کی بقا اور آخرت میں فرض منصبی کی ادائیگی کے سلسلے میں ہونے والی پوچھ گچھ میں نرمی اور آسانی کا سبب بنے گی۔

اس سلسلے میں اہل علم حضرات کے غور و فکر اور اتحاد کی سعی و کوشش کرنے والے مجاہدین کے لیے راہِ عمل کے طور پر ہمارے پاس چند تجاویز ہیں جنہیں ہم اس امت کے اتحاد کی حقیقی بنیادیں سمجھتے ہیں اور ہمارے خیال میں انہیں مستحکم کیے بغیر اتحادِ امت کی کوششیں صحیح معنوں میں بارآور نہ ہو سکیں گی۔

تقویٰ آخرت میں بازپرس اور سزا کے امکان نیز خدا تعالیٰ کے سامنے ہر معاملے میں جوابدہ ہونے کے احساس کا نام تقویٰ ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کا ہر پیرو کار اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں متقیانہ رویے کو اپنائے

اور پیروی نفس اور بغیاً بینھم سے بچے جو کہ اختلافاتِ مذمومہ کی اصل ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ
وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ.

اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں تقویٰ کی روش عام ہو تاکہ وہ مفسدات جنم ہی نہ لینے پائیں جو کہ فرقہ واریت اور انتشار کے پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔

ایک متقی النفس انسان ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے اور ہر اس کام سے جس میں اسے آخرت کا فائدہ نظر نہ آئے بچتا اور حتی الامکان ہوا و ہوس کے ماحول سے دور بھاگتا ہے۔ وہ ہر کام کو خدا تعالیٰ اور رسولؐ کی مقرر کردہ حدود میں رہ کر کرنا چاہتا اور ہر اختلاف کا حل قرآن و سنت میں تلاش کرتا ہے چنانچہ ایک متقی انسان کے ہاتھوں جو ہوا و ہوس سے نفرت کرتا اور نفس کی پیروی سے بچتا ہے یہ ناممکن ہے کہ اتحاد و امت کے شجر طیبہ پر آری چل سکے اور عربی و عجمی یا رنگ و نسل ذات پات اور زبان و مسلک کا اختلاف اس کے ذریعے کوئی قبیح صورت یا فتنے کی شکل اختیار کرلے۔

چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی سے منسلک مسلمان کے ذہن میں آخرت کی جوابدہی کا احساس اور دل میں خداوند کریم کا خوف پیدا کیا جائے۔ کیونکہ انفرادی زندگی میں مسلمانوں کو قرآن و حدیث جس بات کے اختیار کرنے پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ یہی تقویٰ ہے۔

افسوس کے قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق جسقدر یہ کام اہم ہے اسی قدر مصلحین امت کی نظروں سے اوجھل۔

شعورِ اسلامی دوسری اہم بنیاد اسلامی شعور ہے جس کی عدم موجودگی کے سبب وہ اختلافات تفرقہ بن جاتے ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً اہم نہیں ہوتے۔ اسلامی شعور کی عدم موجودگی کی وجہ سے عوام میں معروف اسلامی اخوت اور وسعتِ قلبی کے جوہر ناپید ہوتے جارہے ہیں امت چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹ رہی ہے اور مسجدیں جو کبھی اخوت کا مظہر ہوتی تھیں آج سیاسی اور مذہبی عناصر کی کشاکش کا اکھاڑا بن کر رہ گئی ہیں۔

ان حالات میں یہ ازحد ضروری ہے کہ عوام کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ اسلام کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے جو اسے پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس امت کا ایک حصہ فقہی اور کلامی اختلافات کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور اصل اہمیت قرآن و حدیث کی ہے جو اسلام کا سرچشمہ ہیں جو انہیں مانتا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے وہ خواہ کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو برحق

راستے پر رہے اور اس کا ساتھ دینا افضل ہے۔

امت میں اسلامی شعور قرآن وحدیث کی تعلیمات عام ہو جانے ہی سے پیدا ہوگا چنانچہ جو افراد اور تحریکیں اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں انہیں اس بات پر بہت زیادہ توجہ دینی چاہیئے کہ عوام میں تقویٰ اور اسلامی شعور پیدا ہو تاکہ تعصب اور گھٹن کی فضا ختم ہو اور اسلامی اتحاد اور اقامتِ دین کی راہ ہموار ہو سکے۔

اعتصام بحبل اللہ اس امت کی بنیاد قرآن کریم پر رکھی گئی ہے امت اسوقت وجود میں آئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم نازل ہونا شروع ہوا۔ اسی طرح اسلامی معاشرے کی تشکیل قرآن کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق کی گئی ہے چنانچہ اتحادِ امت اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے قرآن کریم پر جمع ہونا اسے مضبوطی سے تھامنا اور اس کی ہدایات پر سرِ مو انحراف کیے بغیر چلنا ناگزیر ہے۔

ہمارے نزدیک کتاب ہدایت کی موجودگی میں یہ بات درست نہیں ہے کہ مسلمان اپنے اختلافات کا حل یا تو تلاش ہی نہ کریں یا پھر اُس کتاب سے باہر تلاش کریں جس کے لیے رسُولِ اکرمؐ نے فرمایا ہو کہ 'اس میں تمہارے درمیان ہونے والے تمام اختلافات کا حل موجود ہے' 'وحکم ما بینکم'۔

یہ ہماری نظر میں اس کتاب پر اور خود مسلمانوں کے عوام پر ظلم ہوگا اگر ایک صحیح حکم کی موجودگی میں راہ صواب معلوم کرنے کے لیے اس سے رجوع نہ کیا جائے۔

چنانچہ یہ امر از حد ضروری ہے کہ امت اپنے تمام اختلافات و تنازعات میں اس کتاب ہدایت کو حکم تسلیم کرے اس کے فیصلے بہ طیبِ خاطر قبول کرے اور اس سلسلے میں تاویل کے بجائے نظم قرآن، ظاہر معانی، سنت اور سلف سے منقول اجماع پر بھروسہ کرے نیز تمام معاملات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ اور بقا کا ضامن ہے۔

سُنتِ رسُول اللہؐ قرآن حکیم اسلام کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے مگر اس میں اجمال و اختصار بھی ہے چنانچہ دو مشکلات اس سے رجوع کرتے ہوئے درپیش آتی ہیں ایک تو اس میں تمام معاملات کی تفصیلات موجود نہیں دوسرے غیر متقی افراد مجمل آیات کو اپنی خواہش نفسانی کے مطابق معانی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اتحاد پارہ پارہ ہو سکتا ہے چنانچہ اس اندیشہ کا سدِ باب اللہ تعالیٰ نے رسُول بھیج کر کر دیا جس کا فرض منصبی یہ ہے کہ قرآن حکیم میں آنے والے ہر حکم کو عملاً اور قولاً واضح فرمائیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس۔

محدثین کرامؒ کا امتِ مرحومہ پر بہت عظیم احسان ہے کہ انہوں نے انتہائی جانفشانی اور احتیاط سے رسُولِ اکرمؐ کی زندگی کا غالباً ایک ایک لمحہ محفوظ کر لیا ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ہر معاملے میں تفصیل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوے میں تلاش کی جائے اور اگر ایک معاملے میں ایک سے زائد احادیث ملیں تو حضرت امام اعظمؒ کے دیئے ہوئے اس سنہری اصول پر عمل پیرا ہوا جائے کہ اذا صح الحدیث فھو مذہبی، جو حدیث اصح ہو وہی میرا مذہب ہے۔ اور اگر ایک معاملے میں بالکل ایک ہی حدیثیں ایک سی سند اور ایک صحت کی آجائیں تو اقرب الی المفہوم القرآن حدیث لیکر دوسری کی تطبیق یا معقول توجیہہ کر دی جائے ورنہ ہر دو پر عمل میں آزادی دے دی جائے۔

اس طرح اُمید ہے کہ اختلافات کی خلیج مٹ جائے گی اور اتحاد کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو جائے گی۔

ہمارا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ سنت نبویؐ آج بھی اور آئندہ بھی پیدا ہونے والے مسائل حیات کو صحیح صحیح حل کرنے اور ہر بحرانی صورتحال اور کیفیت سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور خلوص دل سے کوشش کی جائے تو یہ مسلم امہ کے درمیان ہر قسم کے اختلافات کو ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

خلافتِ اسلامیہ کا احیاء اس امت کی مثال ایک ایسی عمارت کی ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تقویت کا سبب بنتا ہے اور ایک حصے کا نقصان یا انہدام دوسرے تمام حصوں کو متاثر کرتا ہے۔ امت مسلمہ کی ایک عرصہ دراز سے یہ کیفیت ہے کہ یہ اپنی آفاقیت کھو کر قوموں اور ممالک کی حدوں میں محدود ہو کر اور بٹ کر رہ گئی ہے جس کا اصل سبب اس کی مرکزیت کا خاتمہ ہو جانا ہے۔ امت کے اتحاد اور اس کی آفاقیت کے ایکبار پھر واپس لانے کا طریقہ صرف ایک ایسے با اختیار اجتماعی ادارے کا قیام ہے جو اس کی دینی اور دنیوی معاملات میں قرآن و سنت کے مطابق رہنمائی کر سکے جو امت کی جانب سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے اور امت کے تمام ذرائع و رسائل جمع کر کے اور تمام علاقوں میں بکھری ہوئی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لا کر منظم اور مربوط طریقے سے امت کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے اور اس امت کو آنحضورؐ کے بتلائے ہوئے سیدھے راستے پر گامزن رکھے۔ ہماری مراد خلافت علیٰ منہاج نبوت کے قیام سے ہے جو مسلمانوں کی قوت کا مظہر اور مرکزیت کا سرچشمہ ہے اور اتحاد کے اکثر داعیان اور مصلحین امت جس کے قیام سے بے پرواہ یا مایوس ہو گئے ہیں حالانکہ اس کے قیام کیلئے جدوجہد فرض کا درجہ رکھتی ہے اور اتحاد کی کوششیں اس کے قیام کے بغیر بارآور نہیں ہو سکتیں۔

قرآن و سنت امت مسلمہ کی فکری بنیادیں ہیں اور خلافت اسلامیہ اس کی عملی وحدت کی بنیاد ہے خلافت اسلامیہ کا احیاء اسوقت کی تمام اسلامی تحریکوں اور اسلامی حکومتوں کے پیش نظر ہونا چاہیئے نیز اصحاب علم حضرات کو چاہیئے کہ ہر اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر اس طرف حکومتوں اور سربراہوں کی توجہ مبذول کرائیں۔ شاید کہ تحریک خلافت کے شہیدوں کا خون اس طرح رنگ لائے۔

اٹھاتے ہوئے اوران کی آراء کا اُفاقی حصہ برقرار رکھتے ہوئے۔

اگرچہ یہ کام بظاہر ناممکن العمل نظر آتا ہے مگر درحقیقت جس طرح خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ممکن ہے اسی طرح عالمی فقہ کی تدوین وتنفیذ بھی عین ممکن ہے۔ اگر کچھ اسلامی ممالک مثلاً پاکستان ایران سوڈان سعودی عرب وغیرہ کی حکومتیں ملکر اس کی طرف توجہ کریں اور ایسے اصحاب علم جن پر عوام المسلمین کو اعتماد ہو اس کام پر مامور کریں تو امید ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ کام ہو جائے گا بلکہ دیگر مسلم ممالک بھی اس میں شامل ہو جائیں گے اور اس کی اہمیت کو سمجھ کر فقہ عالمی اپنے ممالک میں نافذ بھی کریں گے۔

چند فوری اقدامات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ میری امت کے ہر بگاڑ (چھوٹے یا بڑے) کی ذمہ داری علماء اور امراء پر عائد ہوتی ہے۔ او کما قال۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس امت کی خرابیوں اور بگاڑ کی درستگی بھی انہیں دو طبقات کے ذریعہ ممکن ہے۔ چنانچہ افتراقِ امت اور عوام وخاص میں جہالت اور تقویٰ کا فقدان قسم کی جو خرابیاں ہیں وہ انہیں دو طبقات کے ٹھیک کرنے سے ٹھیک ہونگی۔

اس سلسلے میں علماء تو یہ کام کر سکتے ہیں کہ افراد میں تقویٰ اور شعورِ اسلامی مبنی بر تعلیماتِ قرآن و حدیث پیدا کریں تاکہ وسعتِ قلبی پیدا ہو سکے۔ اور جمعہ وعیدین کے خطبات میں بجائے فریق مخالف پر کیچڑ اچھالنے کے قرآن وسنت کی روشنی کو عام کریں اور مناظرہ ومباہلہ بازیوں اور اشتعال انگیز بیانات سے پرہیز کریں تاکہ نفرت کی فضا کم ہو۔

تحریر وتقریر کی قوت سے کام لیکر عوام وخاص کو فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے تیار کریں اور قیام خلافت واماارت شرعیہ کے لیے ان کی توجہ مبذول کرائیں جس کے عدم وجود سے امت ایک اہم فریضہ کی تارک اور اجتماعیت سے عاری ہے اور مرنے والے جو اس کے قیام اور اس کی کوششوں میں شامل ہوئے بغیر مر رہے ہیں جاہلیت کی موت کا شکار ہو رہے ہیں۔

من خلع یداً من طاعۃٍ لقی اللہ یوم القیامۃ لا حجۃ لہ ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃً جاھلیۃ (مسلم عن عبداللہ ابن عمر)

دوسرے علماء انفرادی اور اجتماعی طور پر جدید مسائل سے آگاہی حاصل کر کے حکومت اور عوام کی ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے رہنمائی کریں۔ حکومتوں پر اندرون ملک اس ضمن میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی قسم کا اشتعال انگیز لٹریچر فرقہ وارانہ بیان یا اسی طرح کی دل آزار چیز نہ چھپنے دیں۔ حکومتیں مساجد اور مدرسوں کو اپنے انتظام میں لے انکی بھرپور سرپرستی کرے اور نصاب تعلیم میں از کار رفتہ علوم نکال کر جدید علوم داخل کرے جنہیں اسلامی نقطۂ نظر سے پڑھایا جائے۔

بین الاقوامی سطح پر کیونکہ ہمیں ایک پلیٹ فارم یعنی اسلامی کانفرنس میسر ہے اس لیے اس

فقہِ عالمی کی تدوین وتنفیذ

فقہ یا اسلامی قانون کی تدوین اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانے میں عمل میں آئی جب اس قسم کے کاموں کی طرف سے حکومت کی توجہ اور سرپرستی ختم ہو چکی تھی دوسرے حکومتیں بھی اس معیار کی نہ تھیں کہ عوام ان پر مکمل بھروسہ کر سکتے چنانچہ اسلامی قانون کی تدوین کا وہ اہم کام جو اس وقت کا سب سے بڑا چیلنج تھا اکابرینِ امت نے شخصاً شخصاً سنبھالا اور اس اہم فریضہ کی ادائیگی انفرادی سطح پر ان افراد کے ہاتھوں ہوئی جن پر امت کو مکمل اعتماد اور جن کی فراست و تقویٰ پر کامل یقین تھا۔ انفرادی سطح پر اتنا عظیم کام ہونے کے سبب سے امت میں قانونی اور فقہی وحدت برقرار نہ رہ سکی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امت فرقوں میں بٹ گئی ہو بلکہ اس سے مُراد صرف یہ ہے کہ امت ایک عالمگیر قانون بایں معنی وجود میں نہ لا سکی جس پر تمام امت کا اتفاق ہو۔ اسی طرح یہ فقہیں اس دور میں وجود میں آئیں جب تدوینِ حدیث کا کام ابتدائی حالت میں تھا یعنی زیادہ سے زیادہ اپنے شہر یا ملحقہ بلاد میں پائی جانے والی احادیث جمع کر لی گئی تھیں اور انہیں سے کام چلایا جا رہا تھا چنانچہ بعض اوقات ایک صحیح حدیث سے لاعلمی کی بنا پر کم درجہ کی حدیث یا قیاس پر فیصلہ کر دیا گیا جو کہ اس فقہ کا مستقل جزو بن گیا۔

یہ بھی ایک بیّن حقیقت ہے کہ زمانہ مسلسل تغیر پذیر ہے اور زمانے کے نت نئے مسائل ایسا اوقات ایسی گھمبیر صورت اختیار کر جاتے ہیں جنہیں پُرانے نظائر و شواہد کی مدد سے حل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اس صورتحال میں اجتہاد از حد ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اتحادِ امت میں فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے ضرُوری ہے اُس کا تقاضا ہے کہ امت ہر جدید مسئلے کا حل قرآن و سُنت کی روشنی میں پیش کر کے دنیا کو راہِ صواب دکھائے آن تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ مخلص حضرات کی یہ رائے ہے کہ تمام ممالک اپنی اپنی فقہ مُدوّن کریں مگر ہم اس رائے سے اس لیے متفق نہیں ہیں اس لیے کہ جب تدوین حدیث کا کام مکمل ہو چکا اور زمانہ بھی اس مقام پر دنیا کو لے آیا ہے کہ وہ ایک گھر کا آنگن بن گئی ہے تو کیوں نہ فقہی اختلافات کو ملکی سطح تک وسیع کرنے کے بجائے تمام ممالک کے علماءِ جدید و قدیم کو جمع کر کے ایک عالمی فقہ کی تدوین کا کام شروع کر دیا جائے تاکہ تمام اسلامی ممالک میں جدید مسائل پر ایک ہی سا رویہ اور ردعمل سامنے آئے جو کہ امت کی قانونی وحدت کا بھی ترجمان ہو گا اور امت کی اکثریت کا فیصلہ ہونے کے سبب سے صائب بھی۔ ہماری رائے میں فی الحال عقائد اور عبادات کو تو افراد پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ عوام کا براہِ راست ان سے تعلق ہوتا ہے اور ان میں اجتہاد سے ان کا اعتماد ان پر سے بلکہ کل دین پر سے اٹھ جائے گا جو یقیناً ناقابل بیان نقصان ہو گا البتہ غیر تشریعی فقہی حصے پر اجتہاد کیا جانا چاہیئے تاکہ مسائل جدیدہ میں اسلام کا نقطۂ نظر سامنے آئے نیز قانونی (عدالتی و حکومتی) حصے پر بھی اجتہاد اور قرآن و حدیث کی روشنی میں نظر ثانی کی جانی چاہیئے مگر بزرگوں کی محنت سے فائدہ

سطح پر اتحاد کے لیے اسلامی کانفرنس کو کوششیں کرنی چاہئیں۔

ہمارے خیال میں اسلامی کانفرنس کو ایک اسلامی اتحاد قائم کرنے اور اسلامی بلاک کو دنیا میں فیصلہ کن طاقت بنانے کے لیے یہ چند اقدامات کرنے ضروری ہیں۔

خارجہ پالیسیوں میں اتحاد اسلامک وزراء خارجہ کانفرنس کو چاہیئے کہ مسلم ممالک کی خارجہ پالیسیوں میں تضاد اور شر قاً غرباً جھکاؤ کا بالکلیہ خاتمہ کرنے کی کوشش کرے اور ایسا مشترک لائحہ عمل مرتب کرے جو تمام مسلم ممالک کے مفاد میں ہو اور اس سے مسلم ممالک کا اسلامی کردار اُجاگر ہو۔

بین الاسلامی عالمی عدالتِ عظمیٰ کا قیام اسلامی ممالک کے آپس کے جھگڑوں اور قضیوں یا کسی اسلامی ملک کے اہم اندرونی و بیرونی معاملات کے تصفیے کے لیے اس عدالت کا قیام ضروری ہے اس کا فیصلہ نافذ العمل ہونا چاہیئے۔

اس کے قیام کا دوسرا اہم مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ یہ عدالت تمام اسلامی ممالک کے آئینوں اور قوانین کا قرآن و سنت کی روشنی میں جائزہ لے اور ان میں سے غیر اسلامی عناصر کو نکال کر اسلامی تعلیمات کے مطابق ترمیم کرے تاکہ اسلامی ممالک کے عبوری دور اور غیر یقینی صورتحال کا خاتمہ ہو۔

اس عدالت کی شاخیں تمام اسلامی ممالک میں قائم کی جانی چاہئیں جو کہ ہر ملک میں اسلامی قانون کی تنفیذ اور عدالتوں کے قیام میں اس ملک کی مدد کریں نیز اسے غیر اسلامی اقدامات سے روکیں۔

بین الاسلامی عالمی اقتصادی ادارے کا قیام اسلامی کانفرنس ماہرین معاشیات (اسلامی و جدید) اور وزراء خزانہ پر مشتمل یہ ادارہ قائم کرے اور اس کے ذمے یہ کام کرے۔

اولاً اسلامی اقتصادیاتی نظام کا ہر ملک میں قیام تاکہ اسلامی ممالک غیر اسلامی اقتصادی نظاموں کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں اور ان کا اقتصادی بحران ختم ہو۔

ثانیاً یہ ادارہ اسلامی ممالک کے ذرائع و وسائل کی تنظیم نو میں ان کی مدد کرے اور ترقیاتی پروگراموں اور بنیادی ٹیکنالوجی کے حصول میں ان کی مدد کرے۔

ثالثاً یہ ادارہ اس امر کا اہتمام کرے کہ ورلڈ اسلامک بنک کی شاخیں بالعموم تمام دنیا اور بالخصوص اسلامی ممالک میں پھیل جائیں تاکہ اسلامی بنکاری کو فروغ ملے نیز اسے کوشش کرنی چاہیئے کہ تمام مسلمان غیر مسلم ممالک کے بنکوں سے اپنا سرمایہ نکال کر اسلامی بنک میں جمع کرائیں تاکہ اسلامی ممالک کے ترقیاتی منصوبے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچیں اور مسلمانوں کا سرمایہ اسلام کے اور ان کے خلاف نہ استعمال ہو۔

بین الاسلامی دفاعی ادارے کا قیام اسلامی کانفرنس کو چاہیئے کہ اسلامی ممالک کے وزراء دفاع

اورافواج کے سربراہان پر مشتمل ایک سپریم اسلامک کمانڈر بنائے جو ان پانچ مقاصد کے لیے کام کرے۔

اولاً تمام اسلامی ممالک کی افواج کا اشتراک اور انہیں ایک سپریم کمانڈ کے تحت کرنا۔

ثانیاً تمام اسلامی ممالک کی سرحدوں کو مشترکہ دفاعی لائن قرار دے کر ان کی حفاظت کرنا تاکہ کوئی اور اسلامی ملک فلسطین جنوبی لبنان اور افغانستان کی طرح کفار کے شر کا نشانہ نہ بن سکے۔ یہ ادارہ اس بات کی بھی کوشش کرے کہ تمام کھوئے ہوئے اسلامی خطے دوبارہ امتِ مسلمہ کو واپس مل جائیں تاکہ ان لبسنے والے مسلمان سکھ چین کا سانس لے سکیں۔

ثالثاً اسلامی ممالک کی افواج کی تنظیم نو اور جدید خطوط کے مطابق تربیت کیونکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلامی ممالک کی افواج میں سے اکثر جدید تنظیم و تربیت سے محروم اور ملک کا دفاع کرنے سے صحیح طور پر قاصر ہیں۔ رابعاً اسلامی ممالک کی افواج میں اسلامی سپرٹ کو پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور انہیں اسلامی فلسفۂ جہاد سمجھانا تاکہ ان میں اپنے فرائض کا حقیقی احساس پیدا ہو اور ان کی ذہنی تربیت از روئے اسلام ہو سکے اور ان میں اسلامی تشخص اُجاگر ہو۔

خامساً۔ اعدوالھم ما استطعتم من قوۃٍ کے فرمان الٰہی کی تکمیل کے لیے نہ صرف جدید آلات جنگ بلکہ ان کی ٹیکنالوجی کا حصول تمام اسلامی ممالک کی بری بحری اور فضائی افواج کے لیے کیا جائے تاکہ اغیار کی بالادستی سے اس میدان میں بھی نجات مل جائے۔

بین الاسلامی فنی ادارے کا قیام

کوئی بھی ذی شعور مسلمان اس وقت اس بات سے غافل نہیں ہوگا کہ یورپ کی برتری اور تیسری دنیا کی پستی اور زیردستی کا اصل سبب یورپ کا ٹیکنیکل تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنا اور ٹیکنالوجی کی قوت کا اپنے حق میں استعمال کرنا ہے۔ اسلامی ممالک جنکا تعلق زیادہ تر اسی ٹیکنیکل تعلیم سے محروم اور مغرب کی ٹیکنالوجی کی محتاج تیسری دُنیا سے ہے اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنے ممالک میں ٹیکنالوجی کے فروغ اور بنیادی صنعتوں (لوہا، پلاسٹک وغیرہ کی) کے قیام پر صحیح طور پر توجہ نہیں دیں گے۔ اس لیے اسلامی سربراہی کانفرنس کو ایک ایسی کانفرنس کا قیام عمل میں لانا چاہیئے جو کہ تمام اسلامی ممالک کی ٹیکنیکل صلاحیتوں کا جائزہ لے اور پھر انہیں منظم طور سے استعمال میں لائے۔ جو اسلامی ممالک میں بنیادی صنعتوں اور ٹیکنیکل یونیورسٹیز اور کالجز کے قیام و فروغ کی کوشش کرے اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول میں اسلامی ممالک کی مدد کرے اس طرح مسلمان ممالک کی فنی صلاحیتیں صحیح طور پر کارآمد ثابت ہوں گی اور وہ اغیار جو مسلمان ممالک کے خام مال سے فائدہ اٹھا کر بھی انہیں اپنا مسلسل محتاج بنائے ہوئے ہیں ان کی اس سازش سے بھی امتِ مسلمہ نکل آئے گی۔

(باقی صفحہ پر)

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴۰ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

NOVEMBER 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 11

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ :۔
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں ؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اَہَم مَوضُوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

هدیہ فی نسخہ : تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا :